بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور

زیر سرپرستی:
عزیز ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبد الحفیظ صاحب قبلہ
سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

جلد نمبر ۴۰ شمارہ ۳

مارچ ۲۰۱۶ء

جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ: مبارک حسین مصباحی
نائب مدیر: محمد طفیل احمد مصباحی
منیجر: محمد محبوب عزیزی
تزئین کار: مہتاب پیامی

مجلسِ مشاورت

مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی
مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی
مولانا محمد ادریس بستوی مصباحی
مولانا عبد المبین نعمانی مصباحی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور اعظم گڑھ یو۔پی۔ ۲۷۶۴۰۴	**THE ASHRAFIA MONTHLY** Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404	قیمت عام شمارہ: 20 روپے سالانہ: 200 روپے
چیک اور ڈرافٹ بنام **مدرسہ اشرفیہ** بنوائیں	کوڈ نمبر ——— 05462 دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149 الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092 دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122	سری لنکا، بنگلادیش، پاکستان، سالانہ 500 روپے دیگر بیرونی ممالک $ 20 امریکی ڈالر £ 15 پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: ashrafiamonthly@gmail.com

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

مشـــــــمـــــــولات

اداریــــــــه	مبارک پور میں عظیم الشان نعتیہ پروگرام۔ حضرت عزیز ملت کو امام احمد رضا ایوارڈ	مبارک حسین مصباحی	۳

---------------تدبرات---------------

وعظ وارشاد	اہلِ سنت کی شیرازہ بندی۔ مسائل وامکانات	علامہ محمد احمد مصباحی	۷

---------------فقهیات---------------

آپ کے مسائل	کیا فرماتے ہیں.............	مفتی محمد نظام الدین رضوی	۹

---------------نظر یات---------------

فکـــــرامروز	تخلیقِ کائنات: سائنسی حقائق آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں	مولانا محمد اسحاق اکبری	۱۱

---------------اسلامیات---------------

تحقیقات	مدعیِ نبوت مرزا قادیانی پر اولین فتویٰ کفر کی تحقیق (آخری قسط)	محمد ثاقب رضا قادری	۱۴

---------------تعلیمات---------------

آئینۂ عالم	یورپ پر دینی درس گاہوں کے اثرات (آخری قسط)	مولانا محمد فروغ القادری	۲۰
جائزہ	اسلامی ثقافت کی ترویج واشاعت میں مدارس کا کردار	مولانا محمد عابد چشتی	۲۳

---------------تار یخیات---------------

آئینۂ وطن	تحریکِ آزادی میں علماے اہلِ سنت کا کردار	مولانا محمد ابرار علی مصباحی	۲۵

---------------شخصیات---------------

انـــوارِ حیات	حافظِ ملت کی شخصیت سازی	مولانا ثناء اللہ اطہر مصباحی	۲۸
اسلوب	حافظِ ملت کا اسلوب تحریر	محمد طفیل احمد مصباحی	۳۲

---------------بزمِ دانش---------------

فـکـرونـظـر	عالمی دہشت گردوں کو اسلحہ کی فراہمی، کیوں اور کیسے؟	غلام رسول دہلوی/محمد عابد چشتی	۳۸

---------------ادبیات---------------

گوشۂ ادب	ممبئی عظمیٰ کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر مشاہد حسین رضوی	۴۲
نـقـدونـظـر	تجلیاتِ نوری	مبصر: عطاء الرحمٰن نوری	۴۶
خیابانِ حـرم	نعت ومناقب	ڈاکٹر صابر سنبھلی/پھول محمد نعمت رضوی	۴۷

---------------وفیات---------------

سفرِ آخرت	حضرت علامہ غلام رسول سعیدی کا سانحۂ ارتحال	مبارک حسین مصباحی	۴۸

---------------مکتو بات---------------

صدایے باز گشت	محمد انیس، رئیس احمد عزیزی، عابد محمود عزام، محمد اختر علی واجد القادری، سید قمر الاسلام		۵۲

---------------سر گرمیاں---------------

خیر وخبر	دار العلوم سلطان الہند میں عرس پاسبانِ ملت۔ عالمِ اسلام کی موجودہ صورتِ حال۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی پر سیمینار		۵۵

اداریہ

مبارک پور میں تاریخ ساز جشن عید میلاد النبی ﷺ اور نعتیہ پروگرام

حضرت عزیز ملت کو امام احمد رضا ایوارڈ

مبارک حسین مصباحی

جامعہ اشرفیہ مبارک پور خاکِ ہند میں شہرتوں کے بامِ عروج پر ہے۔ فرزندانِ اشرفیہ کی دینی، علمی، تدریسی اور فقہی خدمات کا چرچا ہر طرف ہے۔ اس نے اور اس کے ذیلی اداروں نے امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ العزیز کی عظیم شخصیت و نظریات پر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت مفتیِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ کے فیوض و برکات کل بھی جاری تھے، آج بھی جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گے۔ اطاعتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کی جو دولت اپنے بزرگوں سے ملی ہے اس کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

۸ر فروری ۲۰۱۶ء کو لال چوک، پرانی بستی میں حسبِ سابق عظیم الشان جشن عید میلاد النبی ﷺ اور نعتیہ پروگرام ہوا۔ جشن کی سرپرستی عالی جناب الحاج محبوب احمد گرافر مبارک پوری نے فرمائی، صدارت محترم الحاج انوار احمد لال چوک نے فرمائی جب کہ قیادت کے فرائض شہزادۂ عزیز ملت حضرت نعیم ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی استاذ جامعہ اشرفیہ نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مولانا محمد کامل رضا نے نظامت فرمائی، پروگرام کا انعقاد نوجوانان کمیٹی محلہ لال چوک مبارک پور کے زیر اہتمام ہوا۔

تلاوت و نعت سے پروگرام کا آغاز ہوا، یکے بعد دیگرے حسب ذیل چودہ انجمنوں نے بارگاہِ رسول ﷺ میں نعتیہ کلام پیش کرنے کا شرف حاصل کیا۔ انجمن اخلاقیہ محلہ حیدر آباد، انجمن فیضانِ عزیزی محلہ پورہ خواجہ، انجمن گلزارِ مصطفی قصبہ خیر آباد، انجمن چراغ اسلام قصبہ خیر آباد، انجمن فیض عام محلہ پورہ رانی، انجمن ملت اسلامیہ محلہ پورہ صوفی، انجمن تنویر الاسلام محلہ نیا پورہ، انجمن تاج دارِ حرم قصبہ ابراہیم پور، انجمن فیضانِ مصطفیٰ محلہ نوادہ، انجمن اسلامیہ محلہ لال چوک، انجمن رحمانیہ محلہ پرانی بستی، انجمن غوثیہ محلہ پرانی بستی، انجمن تاج دارِ حرم محلہ پورہ دلھن اور انجمن مظلومیہ محلہ پورہ خضر۔ اس موقع پر ہم ان شعرائے کرام کو بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں جنھوں نے عشقِ رسول ﷺ میں ڈوب کر نعتیں لکھیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید توفیقاتِ خیر سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

مبارک پور کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے، انجمنیں جب لے سے لے ملا کر نعتیہ کلام پڑھتی ہیں تو سامعین پر کیف و وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے، انعامات کا سلسلہ بھی خوب چلتا ہے۔ شہزادۂ حافظِ ملت حضرت عزیز ملت علامہ شاہ عبد الحفیظ عزیزی سربراہِ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اس پروگرام کے مہمانِ خصوصی تھے، ساڑھے نو بجے کے قریب لگ بھگ سو دیوانے قیام گاہ پر حاضر ہوئے اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ نعروں کی گونج میں حضرت کو اسٹیج پر لائے۔ آپ کی آمد کے بعد نعتیہ پروگرام کی بہاروں کے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نعیم ملت حضرت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی نے مائک سنبھالا اور دس منٹ کا ایک پر زور خطاب فرمایا، آپ نے مبارک پور کی نعتیہ روایت اور عشقِ رسول ﷺ کو بیان کیا، باشندگان مبارک پور کے دینی ذوق و شوق پر بھی بھرپور روشنی ڈالی، اس کے ساتھ آپ نے جامعہ اشرفیہ کی آفاقی خدمات اور حضرت عزیز ملت دامت برکاتہم العالیہ کی گراں قدر قربانیوں کا نقشہ پیش فرمایا۔ سب سے پہلے نصیرِ ملت حضرت علامہ نصیر الدین عزیزی استاذ جامعہ اشرفیہ، حضرت مولانا شمس الہدیٰ مصباحی، استاذ جامعہ اشرفیہ اور محترم المقام الحاج قمر الحق مبارک پوری وغیرہ نے آپ کی بارگاہ میں امام احمد رضا ایوارڈ دس گرام سونے کے ایک میڈل کی شکل میں پیش کیا، اور اس کا ایک خوب صورت سپاس نامہ پیش کیا، امام احمد رضا ایوارڈ کا سپاس نامہ حضرت مولانا مفتی زاہد علی سلامی استاذ و مفتی جامعہ اشرفیہ نے پڑھ کر سنایا۔ ایک انتہائی خوب صورت طغریٰ شریف، ایک چاندی کا قلم، ایک حسین ڈائری، اے سی کمبل اور ایک قیمتی شال نذر کی، پورا مجمع نعروں کی آواز سے گونجنے لگا۔ اسی دوران لال چوک کے ایک ذمہ دار محترم نسیم احمد صاحب نے حضرت عزیز ملت کے ذریعہ جامعہ اشرفیہ کو ایک لاکھ روپے کا چیک عنایت فرمایا۔ اب ذیل میں آپ امام احمد رضا ایوارڈ کا سپاس نامہ ملاحظہ فرمائیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم*نحمدہ و نصلی و نسلم علی حبیبہ الکریم

سپاس نامہ-امام احمد رضا ایوارڈ

بخدمت گرامی عزیز ملت شہزادۂ حضور حافظ ملت علامہ شاہ عبدالحفیظ صاحب مدظلہ العالی، سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ

محترم حضرات! آج ہم اراکین کمیٹی نوجوانان لال چوک بے پناہ خوش ہیں کہ عزیز ملت دام ظلہ العالی کی بارگاہ میں "امام احمد رضا ایوارڈ" پیش کررہے ہیں، یہ ایوارڈ حضرت کی گوناگوں دینی وروحانی، ثقافتی وتعلیمی اور تعمیری وتنظیمی خدمات اور کارناموں کا اعتراف ہے۔

حضور عزیز ملت دام ظلہ العالی ۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ/۱۹۴۴ء بروز چہار شنبہ بھوج پور، ضلع مراد آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے، خلیفۂ اعلیٰ حضرت صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی رضوی علیہ الرحمۃ نے آپ کا نام "عبدالحفیظ" رکھا، جب آپ ہجری سنہ کے اعتبار سے چار سال چار ماہ، چار دن کے ہوئے تو شہزادۂ اعلیٰ حضرت، مفتیِ اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے بسم اللہ خوانی کرائی۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اشرفیہ، مبارک پور سے حاصل کی، بھوج پور میں رہ کر جونیئر ہائی اسکول پاس کیا، فارسی اور عربی زبان مبارک پور میں رہ کر پڑھی، اس کے بعد شبلی کالج اعظم گڑھ سے ہائی اسکول پاس کیا، انٹر میڈیٹ سال اول کے ساتھ ساتھ الہ آباد عربی فارسی بورڈ سے مولوی کا امتحان بھی پاس کیا۔ بی ایس سی سال اول مراد آباد ڈگری کالج سے کرنے کے بعد فائنل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن پاس کیا، پھر میرٹ کی بنیاد پر آپ کو بی. ایس. سی. انجینئرنگ میں وہیں داخلہ مل گیا، انجینئرنگ کرنے کے بعد چند ماہ ممبئی میں سروس کی، لیکن اس ملازمت میں دل نہیں لگا اور نہ ہی سکون ملا، لہٰذا سروس چھوڑ کر بھوج پور آگئے، پھر والد ماجد حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے حکم سے مزید اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے الجامعۃ الاشرفیہ میں داخلہ لے لیا اور دیگر اساتذۂ کرام کے ساتھ اہم کتابیں خود حضور حافظ ملت سے پڑھیں۔

آپ ۱۹۵۴ء میں حضور مفتیِ اعظم ہند سے سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ میں بیعت ہوئے اور آپ کو دیگر حضرات کے علاوہ حضور مفتیِ اعظم ہند علامہ محمد مصطفیٰ رضا بریلوی، برہان ملت مفتی برہان الحق جبل پوری اور مجاہد ملت علامہ مفتی حبیب الرحمٰن اڑیسوی علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے اکابر علما ومشائخ طریقت سے مختلف سلاسل کی خلافت واجازت حاصل ہے۔

یکم جمادی الآخرہ ۱۳۹۶ھ/۳۱/ مئی ۱۹۷۶ء کو حضور حافظ ملت کے وصال کے بعد ۴/ جمادی الآخرہ کو جلسۂ تعزیت کے اختتام پر بہت سے علما ومشائخ کی موجودگی میں آپ کو حضور حافظ ملت کی مسند پر بٹھا کر ان کی جانشینی کا اعلان کردیا گیا۔ اور مبارک پور کے تمام مخلص سنی مسلمان اور جامعہ اشرفیہ کے وفادار مطمئن ہوئے کہ ہم نے حافظ ملت کے بعد ان کے کام کو سنبھالنے کے لیے ایسے شخص کو ذمہ دار بنایا ہے، جس کی رگوں میں حافظ ملت ہی کا لہو گردش کررہا ہے۔

آپ حضور حافظ ملت کے علم وفضل وتقویٰ کے وارث وامین اور صحیح معنیٰ میں ان کے جانشین ہیں، آپ کی صدارت وسربراہی کے زمانے میں جامعہ اشرفیہ نے تعلیمی وتعمیری، دعوتی وتنظیمی اور تحریری واشاعتی مختلف میدانوں میں بے پناہ ترقی کی۔

تعلیمی میدان میں ترقی کا کچھ اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جس وقت آپ سربراہ اعلیٰ کی مسند پر بیٹھے، اس وقت جامعہ میں صرف درجۂ فضیلت تک باضابطہ تعلیم تھی، اس کے علاوہ صرف معقولات میں تخصص کا انتظام تھا، وہ بھی بہت باضابطہ نہیں۔ لیکن اس وقت درجۂ فضیلت کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ حدیث، فقہ، ادب، عربی، تقابل ادیان میں تخصص اور ریسرچ کے باضابطہ شعبے قائم ہیں اور تربیت تدریس (ٹیچنگ ٹریننگ) کا بھی معقول انتظام ہے۔

ان کے علاوہ مجلس شرعی اور مجلس برکات جیسے اہم علمی وتحقیقی شعبے بھی آپ ہی کے دور سربراہی میں قائم ہوئے۔ مجلس شرعی کے زیر اہتمام اب تک تئیس فقہی سیمینار ہوچکے ہیں، جن میں پچھتّر سے زیادہ نئے الجھے ہوئے مشکل مسائل کا فیصلہ ہوچکا ہے، مجلس برکات کے زیر اہتمام درس نظامی کی اہم کتابوں پر جدید حواشی اور تعلیقات کے تیاری کے ساتھ عربی، اردو اور فارسی میں نئی کتابوں کی تصنیف وتالیف اور طباعت واشاعت کا کام ہوتا ہے۔ اس شعبے سے اب تک سو سے زیادہ قدیم وجدید کتابیں شائع ہوچکی ہیں جس نے درسی کتابوں کے میدان میں اہل سنت کو خود کفیل بنادیا ہے۔

اشرفیہ ہاسپیٹل، امام احمد رضا لائبریری، عزیز المساجد اور جامعہ اشرفیہ کے مختلف شعبوں میں مستقل عمارتوں کی تعمیر بھی آپ کے دور سربراہی کے عظیم کارنامے ہیں۔ آپ تن تنہا سال بھر ملک کے مختلف علاقوں میں دعوتی وتبلیغی دورے فرماتے ہیں جس سے جامعہ اشرفیہ کا بے پناہ مالی ومعنوی فائدہ ہوتا ہے۔ آپ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جامعہ اشرفیہ کے خلاف داخلی اور خارجی منفی سرگرمیوں کا بڑے صبر وتحمل اور کمال تدبر سے مقابلہ فرماتے ہیں اور جامعہ پر کسی طرح کی آنچ نہیں آنے دیتے۔

رب کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ اپنے محبوبان بارگاہ کے صدقے میں آپ کا سایۂ کرم دراز فرمائے اور آپ کا علمی وعملی فیضان اسی طرح

جاری وساری رکھے۔آمین. بجاہ حبیبك سید المرسلین ، و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین.

بموقع سالانہ نعتیہ پروگرام، بتاریخ ۲۸/ ربیع الآخر ۱۴۳۷ھ مطابق ۸/ فروری ۲۰۱۶ء بروز دوشنبہ

من جانب: نوجوان کمیٹی، لال چوک، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

حضرت عزیز ملت کا جامع اور پر مغز خطاب

ان تقریبات کے بعد حضرت عزیز ملت دامت برکاتہم القدسیہ نے ایک مختصر اور وقیع خطاب فرمایا، خطاب کے چند گوشے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمة الله و برکاته

نحمده و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و علیٰ آله و صحبه اجمعین

اعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم. بسم الله الرحمٰن الرحیم . وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱)

ماشاء اللہ! آج مبارک پور بہت ترقی کر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقی عطا فرمائے۔ میرا مزاج ان سب چیزوں کا نہیں ہے۔ میں مبارک پور خدمتِ دین کے لیے آیا تھا، موجود ہوں اور رہوں گا (انشاء اللہ)۔ میرا مزاج صرف دین وملت کی خدمت کا ہے۔

یہ حضرات مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تو میں نے یہی کہا کہ مجھے ان سب چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو قوم کا خادم ہوں۔ یہی کیا کم ایوارڈ ہے کہ قوم نے مجھے یہ خدمت کا موقع عنایت فرمایا ہے۔ بہر حال یہ ان کی محبت ہے کہ مجھے یہاں بلا کر ان سب چیزوں سے نوازا ہے، جناب نسیم احمد صاحب اور ان کے احباب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک اسلامی ماحول قائم فرما کر اس پروگرام کو قائم کیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی قائم ہوتا رہے گا۔ میری ایک استدعا پہلے بھی رہی ہے اور آج بھی ہے کہ اسلام وہ مذہب مہذب ہے جو ہمیں اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتا ہے اور اسے قائم رکھنے کے لیے ہمیں سرکارِ دوعالم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا۔...

آج جو ہماری قوم بہت پیچھے ہے اور دنیا کے ماحول میں عجیب وغریب نگاہ سے دیکھی جارہی ہے۔ میں نے صرف خدمت کے لیے اپنی عصری تعلیمات کو قربان کیا ہے اور حافظِ ملت کے مشن کو قائم رکھنے کے لیے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے میری ساری کوششیں ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہیں گی۔ بس آپ میری صحت کے لیے، دعاے خیر کرتے رہیں۔ آپ کی دعاؤں کے سہارے ہی ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور انشاء اللہ بڑھتے رہیں گے۔ اس لیے کہ اس ادارے پر ہمارے بزرگوں کی نگاہیں بھی ہیں اور دعائیں بھی اور اہلِ مبارک پور محسوس کر چکے ہیں کہ بزرگوں کی دعاؤں کے سہارے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور چاہے وہ جو بھی منزل ہو اس منزل کو ہم طے کر لیتے ہیں۔ یہ سب ہمارے بزرگوں کی دعائیں ہیں، چاہے وہ حضور اشرفی میاں علیہ الرحمۃ ہوں، صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ ہوں، حضور مفتیِ اعظم ہند ہوں یا حضور حافظ ملت ان سب کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس مشن سے ہمارے یہ سارے بزرگ خوش ہیں، اس لیے ہم کامیابی سے ہم کنار ہیں۔ اس ادارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو مدینہ منورہ سے بھی کچھ تحفے ملتے رہتے ہیں، یہ تحفہ ہماری زندگی اور کامیابی کا واحد سہارا ہے۔

اہلِ مبارک پور! آپ عشقِ رسول ﷺ میں ہمیشہ سرشار رہیں، ہماری یہی خواہش ہے، یہی ہماری تمنا ہے، کیوں کہ عشقِ رسول کے بغیر کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے عشقِ رسول میں ڈوب کر زندگی گزاریے۔ اگر شاعری بھی کرنی ہے تو عشقِ رسول میں ڈوب کر کرنی ہے۔ اگر پڑھنا بھی ہے تو یہ نہیں کہ ہم نمائش کے طور پر پڑھیں بلکہ اپنے دلوں میں عشقِ رسول ﷺ کی شمع جلا کر ہم اپنا کلام عوام کے سامنے پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا شعور عطا فرمائے۔ اور ہمارے جو بھی اجتماعی کام ہوں وہ اسلام کی تبلیغ، اسلام کی بقا، اور اسلام کے فروغ کے لیے ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر میں اپنے نوجوان احباب کو مبارک باد دیتا ہوں اور ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمیں پہلے بھی عزت بخشی ہے کہ ہمیں اس عہدے پر قائم کیا ہے اور آج بھی عزت دی کہ اسٹیج پر بلایا ہے اور ایوارڈ سے نوازا، میں اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آخر میں ان نوجوانوں کو جنھوں نے ہمیشہ جامعہ اشرفیہ کی اعانت میں اپنی جان اور مال کی قربانی پیش کی ہے، ان کو مبارک باد دیتا ہوں اور ان کے لیے دعاے خیر کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ لوگوں کے لیے دعائیں کرتا ہوں، رات کی تنہائی میں بھی اور جب بھی موقع ملتا ہے، آپ حضرات کے لیے دعا ضرور ہوتی ہے۔

الجامعۃ الاشرفیہ اس وقت پوری دنیا میں سنیوں اور حنفیوں کا سب سے عظیم اور باوقار ادارہ ہے۔ اشرفیہ کو میں نہ اپنے گھر بھوج پور لے جاؤں گا اور نہ مراد آباد لے جا سکتا ہوں، یہ ادارہ مبارک پور ہی میں رہے گا۔ اس لیے مبارک پور کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس ادارہ

کو باقی رکھنے اور آفات وبلیات سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔ کسی کے بہکانے سے، کسی کے ورغلانے سے اپنے دل میں کسی قسم کی بات پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کچھ پوچھنا ہے تو میں مبارک پور ہی میں رہتا ہوں، آپ مجھ سے آکر پوچھ سکتے ہیں، مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہیں، مجھ سے سوال کر سکتے ہیں، مجھ سے مواخذہ کر سکتے ہیں، اس کے لیے ہم تیار ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ایک دین کے قلعہ کو لوگ ہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج دنیا کے حالات عجیب وغریب دور سے گزر رہے ہیں، مسلمانوں کو تباہ وبرباد کیا جارہا ہے، ان حالات میں ہماری اخلاقی اور ایمانی ذمہ داری ہے کہ ہم اتحاد اور اتفاق کے ساتھ زندگی گزاریں، اگر آپ میں سے کسی کو شکایت ہو تو مجھ سے مل سکتا ہے، میں مبارک پور میں رہتا ہوں، جاتا ہوں اور آتا ہوں، اگر تنہا نہ آسکیں تو دس پانچ افراد مل کر آئیں، مجھ سے باز پرس کریں، اشرفیہ کا سارا ریکارڈ تحریری شکل میں محفوظ ہے، اگر کوئی مطمئن نہیں ہے تو میں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا، ضد اور ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اگر کوئی سمجھنا نہ چاہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی مطمئن نہیں کر سکتی۔ یہ باتیں ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو کڑوی لگیں مگر سچ بہت کڑوا ہی لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کے طفیل ہمارے درمیان اتحاد واتفاق پیدا فرمادے۔

ہم آخر میں ایک بار پھر نوجوانان کمیٹی لال چوک کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حوصلوں کو بلند فرمائے اور انھیں اور ہم سب کو نبی پاک ﷺ کی سچی محبت عطا فرمائے۔ آمین۔

دیگر حضرات کو انعامات: قرعہ اندازی کے بعد ۱۴/ انجمنوں میں سے انجمن گلزارِ مصطفیٰ قصبہ خیر آباد کا مبارک نام عمرہ شریف کے لیے نکلا، یہ نام آتے ہی ہر طرف فرحت ومسرت کی لہر دوڑ گئی، انجمن تاجدارِ حرم قصبہ ابراہیم پور کو خواجۂ خواجگاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔ حسب ذیل پانچ انجمنوں (۱) انجمن اخلاقیہ، انجمن فیضان عزیزی، انجمن تنویر الاسلام، انجمن مظلومیہ، انجمن فیض عام کو مندرجہ ذیل انعامات دیے گئے، ایک چاندی کا قلم، ایک ڈائری، ایک شال اور ایک سولہ سورہ۔

حضرت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی کی خدمات کے اعتراف میں ان کی بارگاہ میں ایک عدد شال، ایک چاندی کا قلم اور ایک عدد ڈائری پیش کی گئی۔ اسی طرح ناظمِ اجلاس اور ججوں کو بھی یہی تینوں تحائف نذر کیے گئے۔ واضح رہے کہ تمام انجمنوں کو ایک ایک عدد آبوس کمپنی کا ٹیبل پنکھا دیا گیا۔

شاعرِ اہلِ سنت عالی جناب خیر البشر بشر مبارک پوری محلہ پورہ رانی کو انجمن کے ذمہ داروں نے "حضرت حسان بن ثابت ایوارڈ" پیش کیا، طغریٰ شریف، چاندی کا قلم، ڈائری اور ایک شال، اسی طرح محترم المقام الحاج اقبال احمد، خیر آبادی کی بارگاہ میں "مخیر قوم وملت ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ انھیں بھی طغریٰ شریف، ایک عدد چاندی کا قلم اور ڈائری اور ایک شال پیش کی گئی۔

دینی سوالات اور جوابات: اس پروگرام کا دوسرا گوشہ دینی سوالات تھے، پانچ سوالات تو پوسٹر میں شائع کر دیے گئے تھے، جوابات کے لیے باضابطہ ایک فارم بھی تقسیم کر دیا گیا تھا، جب کہ تین سوالات بروقت اسٹیج سے کیے گئے تھے، آٹھوں سوالات حسب ذیل ہیں۔

(۱)-رسول اللہ ﷺ نے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پرورش میں کتنے دن گزارے؟ (۲)-رسول اللہ ﷺ نے ملک شام کا سفر کس عمر میں اور کیوں کیا؟ (۳)-معجزۂ شق القمر کب اور کہاں ظاہر ہوا؟ (۴)-رسول اللہ ﷺ کی دادی اور نانی کے اسمائے گرامی کیا ہیں؟ (۵)-قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے متعلق کتنے مقامات پر آیاتِ کریمہ میں صراحت ہے؟ (۶)-رسول اللہ ﷺ کو جسمانی معراج ہوئی یا روحانی، شریعت میں جسمانی معراج کے منکروں کا کیا حکم ہے؟ (۷)-کس صحابی کی صحابیت کا انکار کفر ہے (۸)-کس معرکۂ جہاد میں تین سو تیرہ مجاہدین شریک تھے؟

ان سوالات کے جوابات میں بذریعہ قرعہ اندازی جناب محمد اشرف ولد جناب حمید اللہ لال چوک کا نام آیا۔ اس کا انعام پہلے ہی سے عمرہ شریف تھا اس خوش نصیب پر ہم جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔ اس کے بعد پانچ خوش نصیبوں کو حسب ذیل تحائف دیے گئے۔ ایک چاندی کا قلم، ڈائری، شال اور ایک ایک سولہ سورہ شریف۔

پروگرام کا خاص پہلو یہ ہے کہ نوجوان کمیٹی، لال چوک نے عمرہ شریف کے لیے اعزازی طور پر ایک نیک فطرت حافظ قرآن عظیم کا انتخاب کیا، عمرہ شریف کے لیے یہ انتخاب اعزازی تھا، منتخب ہونے والے خوش نصیب کا نام محترم حافظ علی اکبر محلہ لال چوک پرانی بستی ہے۔

نوجوانان کمیٹی لال چوک، بڑی مستعد اور نیک خصلت افراد کی کمیٹی ہے۔ ہمارے اصرار کے باوجود انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ ان کے نام شائع کیے جائیں ہم جامعہ اشرفیہ کی جانب سے بھی نوجوانانِ کمیٹی کے مخلصین کی بارگاہ میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

اہل سنت کی شیرازہ بندی ـــ مسائل وامکانات

مولانا محمد احمد مصباحی

آج جب ہم اہل سنت کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں بنیادی فکری واعتقادی اتحاد کے باوجود عالمی یا ملکی یا صوبائی یا ضلعی سطح پر عملاً کوئی باضابطہ ارتباط نظر نہیں آتا۔ یوں اپنی نجی ضروریات اور وقتی کاموں کے لیے لوگ آپس میں رابطہ ضرور رکھتے ہیں مگر جماعتی و اجتماعی انداز میں کوئی باقاعدہ تنظیم کسی میدان میں نہیں۔ نہ کوئی دعوتی و اصلاحی مرکز ہے جس پر سب متفق ہوں، نہ کوئی روحانی قیادت ہے جو سب کا مرجع اور سب پر اثرانداز ہو، نہ کوئی تعلیمی و تربیتی ادارہ ہے جس میں سب کے لیے کشش ہو اور جس کی پیشوائی سب کو قبول ہو، نہ کوئی علمی تحقیقی تصنیفی انجمن ہے جسے قبول عام حاصل ہو، نہ دوسرے سماجی رفاہی قومی میدانوں میں کام کی کوئی اجتماعی ہیئت ہے جو قابل ذکر ہو۔ اور سیاسی میدان تو بالکل خالی ہے، اس میں نہ ہماری کوئی نمائندگی ہے، نہ قومی و ملکی سطح پر ہمارا کوئی نام و نشان۔ یہ پورا وسیع و عریض میدان غیروں کے لیے محفوظ ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ انفرادی طور پر جماعت میں بہت سارا کام ہورہا ہے اور اسی کی بدولت جماعت کا کارواں کسی طرح رواں دواں ہے لیکن اجتماعیت اور تنظیم کی شان ہی الگ ہے اور اس کے ثمرات وبرکات ہمہ گیر اور پائدار ہیں۔

مسائل: اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل سنت وجماعت جن کا وجود عہد رسالت سے آج تک پورے تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے، یہی ہمیشہ بیرونی واندرونی سازشوں کا نشانہ بنے۔ خارجی طاقتوں کا نشانہ بھی یہی رہے اور داخلی فتنوں کا شکار بھی یہی ہوئے۔ خلافت راشدہ کے دور اخیر میں خوارج کا گروہ ہمارے ہی درمیان سے نکلا اور خود مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہوا، اس کے بعد بھی ہر دور میں ایک تسلسل کے ساتھ فتنے اٹھتے، فرقے بنتے اور باطل مذاہب بڑھتے رہے۔ اہل سنت کی تعداد گھٹتی رہی، اہل حق کو اکثر ادوار میں بیرونی دشمنوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا اور عوام کو داخلی فتنوں سے بچانے کے لیے بھی سرگرم رہنا پڑا۔ ان کی دردمندی، مخلصانہ سرگرمی اور ہمہ جہت مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرقوں کا خاتمہ ہوگیا اور آج ان کی طرف اپنے کو منسوب کرنے والا کوئی نہ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اٹھائے ہوئے کچھ خیالات بعد کے نئے فرقوں میں در آئے اور ان کے اثرات آج بھی باقی ہیں مگر قدیم علماے حق اور ان کے معاونین سے جو کچھ ہوسکتا تھا اس میں انھوں نے کوئی کسر روا نہ رکھی۔

اب اہل سنت پر جن فرقوں کا حملہ زیادہ شدت سے ہورہا ہے وہ تقریباً دو سو سال پہلے کی پیداوار ہیں، یہ اہل سنت ہی کے درمیان سے نکلے اور ایک نیا مذہب بناکر اہل سنت کو صراط مستقیم سے ہٹانے اور نئے جال میں پھنسانے کی مہم تیزی سے شروع کردی۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف حربے استعمال کیے:

۱- کتابیں لکھیں جن میں اہل سنت کے عقائد و معمولات کو شرک وبدعت قرار دیا۔

۲- اجتماعات اور جلسے کرکے لوگوں کا ذہن مسموم کرنے کی کوشش کی۔

۳- لوگوں سے مکانوں، دکانوں پر ملاقات کرکے انھیں اپنی طرف مائل کیا۔

۴- اہل سنت کے درمیان اپنے مکاتب ومدارس قائم کرکے تعلیم و تربیت کے نام پر ہماری نسل کو قریب کیا پھر اسے اپنا ہم عقیدہ اور اپنے مذہب کا داعی ومبلغ بنادیا اسی طرح اہل سنت کے درمیان مسجدیں بنائیں یا ان کی مسجدوں پر قبضہ کیا پھر نمازیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنالیا۔

۵- اسکول اور کالج قائم کرکے عصری تعلیم کا شوق دلایا پھر طلبہ کے ذہن میں اپنا عقیدہ اور مذہب بھی اتار دیا۔

۶- کلمہ ونماز کی تبلیغ کے نام پر ایک جماعت قائم کی اور اس کے ذریعے اہل سنت کے بے شمار افراد اور چھوٹی بڑی بہت سی آبادیوں کو اپنا ہم نوا بنالیا۔

۷- ان کے علاوہ تحقیق وتصنیف، سیاسی وسماجی نقل و حرکت اور دوسرے ہر قسم کے ذرائع سے لوگوں کو پہلے اپنا مداح ومعتقد پھر اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کی۔

ان حرکتوں سے نقصان صرف اہل سنت کو پہنچا، انہی کی تعداد گھٹی، انہی کے افراد اہل باطل کا نشانہ بنے اور وہی طرح طرح کی سازشوں کا شکار ہوئے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔

اب اہل سنت کے سامنے دو چیلنج ہیں (۱) اپنے ٹوٹے ہوئے افراد کو پھر جوڑنا (۲) دیگر افراد کو شکار ہونے سے بچانا

اس کے لیے ضروری ہے کہ دشمن کے پاس جتنے اسلحے اور ہتھیار ہیں ان سے زیادہ ہتھیار اور ان سے قوی اسلحے ہمارے پاس ہوں، ان کے اندر جو سرگرمی اور مستعدی ہے اس سے زیادہ ہمارے اندر ہو۔

اس کے لیے باہمی اختلاف و انتشار سے دوری اور تحفظ عقائد و فروغ مسلک کے لیے اجتماعیت اور شیرازہ بندی کس قدر ضروری ہے، یہ اہل دانش کے لیے محتاج بیان نہیں۔

امکانات: پیشوایان اہل سنت اور درد مندان ملت اگر دل وجان سے متوجہ ہوں تو اسباب و وسائل کی فراہمی ہمارے لیے بھی ممکن ہے اور ایسا ہوسکتا ہے کہ کام کو مختلف حصوں اور شعبوں میں تقسیم کرکے ہر شعبے کے لیے لائق اور فعال افراد پر مشتمل مجلسیں یا بورڈ بنادیے جائیں تاکہ کام آسانی سے ہوسکے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ تین چار یا چار پانچ افراد پر مشتمل ایک تھنک ٹینک یا مجلس اعلیٰ ہو جو پوری بالغ نظری کے ساتھ تمام امور کے لیے منصوبہ سازی، مجالس سازی، اصول سازی اور تنفیذ و ترویج کی ذمہ دار ہو۔ اسی طرح مشکلات اور رکاوٹوں پر غور کرنے اور انھیں دور کرنے پر بھی اس کی نظر ہو۔

یہ کام ممکن ہونے کے ساتھ مشکل ضرور ہے۔ وقت اور سرمایے کی بڑی قربانی چاہتا ہے۔ اتنے بڑے ملک میں پھیلے ہوئے اہل سنت کی شیرازہ بندی اور ہر خطے کے لوگوں کو متحرک و فعال بنانا اور شاطرانہ حملوں کے دفاع کے لیے بیدار و تیار رکھنا کوئی ایسا کام نہیں جو چند دنوں یا ہفتوں کی محنت میں انجام پذیر ہوجائے۔ مہینوں بلکہ برسوں کی مدت درکار ہے۔

ہوسکتا ہے کہ پہلے ہر علاقے کا دورہ کرکے وہاں کے حالات اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے، قابل عمل اور لائق اعتماد افراد تلاش کیے جائیں، پھر جہاں مکتب، مسجد، مدرسہ، اسکول، کالج، شفاخانہ وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت ہو ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور طے شدہ خطوط پر ان کا انتظام معتمد افراد کے سپرد کیا جائے۔ اور جہاں پہلے سے ادارے قائم ہیں انھیں بھی تنظیم سے منسلک کرنے کی کوشش کی جائے اور انھیں زیادہ فعال اور کارآمد بنایا جائے۔

اس طرح ہر جگہ کے حالات سے واقفیت بھی بہم ہوگی اور ہر علاقے کے نمائندے مجلس اعلیٰ کے ماتحت مجلس منتظمہ یا مجلس شوریٰ میں شامل ہوں گے اور برابر ان سے رابطہ رہ سکے گا۔

بہت بڑی مرکزی عمارت اور بہت سے آفسوں اور ورکروں کی بھی ضرورت ہوگی جو ہر علاقے کے حالات جاننے، ان کی رپورٹ پیش کرنے اور عام ضروریات کے لیے اپنے متعلقہ مقامات کا دورہ کرنے کے ذمہ دار ہوں۔

ساری تفصیلات تھنک ٹینک یا مجلس اعلیٰ طے کرسکتی ہے۔ اگر ملک گیر پیمانے پر آغاز مشکل ہو تو جس حد تک بآسانی ابتدا ہوسکے اسی حد پر کام شروع کیا جائے۔ اسی طرح جو کام انفرادی طور پر یا کسی مجلس اور بورڈ کی ماتحتی میں ہو رہے ہیں انہی کو تقویت دی جائے اور جو میدان بالکل خالی ہے اس پر خاص توجہ صرف کی جائے۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ پیش قدمی کس طرح سے ہو؟ کہاں سے ہو؟ اور کون کرے؟ بہرحال یہ اقدام ایک یا چند حساس، دردمند، مخلص اور توانا قلب و جگر کے بغیر ممکن نظر نہیں آتا۔ مگر قوم کے خسارے سے صرفِ نظر کسی طرح روا نہیں۔ اقدام ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہیے۔ واللہ الموفق والمعین۔

اندیشے: اگر سارے اکابر اور پیشوایان قوم اس میں دل چسپی نہیں لیتے تو جو دردمند اور حساس حضرات ہیں وہی پیش قدمی کرکے کام شروع کریں اور آگے بڑھائیں باقی حضرات سے گزارش کی جائے کہ اگر حمایت اور مشارکت نہیں کرسکتے تو مخالفت اور رکاوٹ سے بھی باز رہیں ورنہ احکم الحاکمین کے حضور اہل سنت کے عظیم خساروں کا حساب دینے کے لیے تیار رہیں۔

اگر جماعت کی اکثریت خصوصاً اہل علم و دانش اور اہل ثروت میں یہ احساس بیدار ہوجاتا ہے کہ ہم مسلسل خساروں سے دوچار ہیں اور تلافی کے لیے میدان عمل میں جان و دل، ہوش و خرد، اور زبان و عمل کے ساتھ سرگرم ہونا ضروری ہے تو کام کی راہیں کھل سکتی ہیں ورنہ غفلت و بے حسی کے ماحول میں کامیابی کی توقع فضول ہے۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ اکثریت حساس اور بیدار ہونے کے ساتھ کسی پیش قدمی کی منتظر ہے۔ رب تعالیٰ ہمارا حسنِ ظن راست فرمائے اور سب کو حسب درجہ و مقام اور حسب ہمت وصلاحیت توفیق خیر سے نوازے۔ وھو المستعان وعلیہ التکلان۔

آپ کے مسائل

مفتیِ اشرفیہ مفتی محمد نظام الدین رضوی کے قلم سے

وقف سے متعلق چند ضروری مسائل

ایک مسجد کا متولی اپنے ذاتی مکان میں ہزاروں لیٹر کی ٹنکی میں مسجد و مدرسہ کی لائٹ استعمال کر کے پانی بھرتا ہے، اس پر مسجد و مدرسہ کے دیگر ذمہ داران میں سے چند لوگوں نے اعتراض کیا اور متولی صاحب سے کہا کہ آپ مسجد و مدرسہ کی لائٹ کا استعمال کر کے پانی استعمال کر رہے ہیں تو آپ کو بھی اس لائٹ بل میں حصہ لینا چاہیے، اس پر متولی صاحب نے جواب دیا کہ میں بحیثیت متولی شرعًا اس کا حق دار ہوں کہ میں مسجد و مدرسہ کی لائٹ استعمال کر کے پانی حاصل کروں اور لائٹ بل مسجد و مدرسہ ہی ادا کرے، جب کہ اعتراض کرنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ مسجد و مدرسہ میں جو بور وقف کیا گیا ہے، اس کا مقصد صرف اور صرف مسجد و مدرسہ کے لیے استعمال ہے۔

اس پس منظر میں آپ کی خدمت میں چند سوالات ہیں:

(۱) متولی کو اپنے ذاتی مکان میں ہزاروں لیٹر کی ٹنکی میں مسجد و مدرسہ کے بور سے مسجد و مدرسہ کی لائٹ استعمال کر کے پانی بھرنا اور اپنے اور اپنے اہل و عیال کے استعمال میں لانا شرعًا کیسا ہے؟ جب کہ متولی کا بیٹا بذاتِ خود مستطیع اور اہل و عیال والا ہے؟

(۲) کیا مسجد و مدرسہ کے نگراں و متولی کو مسجد و مدرسہ کے لیے وقف کیا گیا کوئی سامان اپنے ذاتی مکان میں استعمال کرنا شرعًا جائز ہے؟

(۳) مسجد و مدرسہ کے تعمیراتی کام کے آغاز کے وقت مسجد و مدرسہ کے تعمیراتی کام کے لیے متولی کے ذاتی گھر سے لائٹ کا استعمال جتنے دنوں کیا گیا اتنے دنوں کی لائٹ بل کی مکمل ادائیگی مسجد و مدرسہ ہی کی طرف سے کی گئی، اب جب کہ مسجد و مدرسہ میں لائٹ کا اپنا کنکشن ہو گیا تو متولی نے مسجد و مدرسہ کی لائٹ سے بور استعمال کر کے اپنے ذاتی مکان میں پانی لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد چند حضرات نے ان سے کہا کہ جو مسجد و مدرسہ کی لائٹ استعمال کر کے آپ پانی لیتے ہیں اس کا بل آپ کو ادا کرنا چاہیے۔

(۴) اگر صرف مسجد و مدرسہ کے ذمہ لائٹ بل ادا کرنے کا حکم عائد ہوتا ہے تو ہم لوگ مسجد و مدرسہ کی طرف سے اس کی ادائیگی کریں گے اور اگر متولی کے ذمہ بھی کچھ ادائیگی لازم ہوتی ہے اور وہ پھر بھی اس کی ادائیگی نہ کریں اور یہی کہیں کہ ہم ادا نہیں کریں گے، یہ ہمارا حق ہے تو ایسی صورت میں متولی صاحب کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) مسجد و مدرسہ کے متولی جب حافظ و عالم ہیں اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ: ”میں بحیثیت متولی شرعًا اس کا حق دار ہوں کہ میں مسجد و مدرسہ کی لائٹ استعمال کر کے پانی حاصل کروں اور لائٹ بل مسجد و مدرسہ ہی ادا کرے۔“ تو وہ اپنے اس استحقاق پر شرعی ثبوت کتابوں کی عبارات اور حوالے کے ساتھ پیش کریں، یا اس کی جو بھی شرعی وضاحت ان کی نگاہوں میں ہو وہ بتائیں، تاکہ اس میں غور کیا جا سکے، اور تنازعہ کا تصفیہ ہو جائے۔

اور اگر وہ اپنے استحقاق پر کوئی شرعی ثبوت یا وضاحت نہ پیش کر سکیں تو ان کا دعویٰ استحقاق نامسموع ہوگا اور حکم ہوگا کہ مسجد و مدرسہ کے نگراں و متولی کو مسجد و مدرسہ کے لیے وقف کیا گیا کوئی سامان اپنے ذاتی مکان اور نجی ضروریات میں استعمال کرنا ناجائز و گناہ ہے۔ فقہا فرماتے ہیں: مراعاة غرض الواقفين واجبة. واقفین (وقف کرنے والے) کے غرض و مقصد کا لحاظ واجب ہے۔ نیز فرماتے ہیں: شرط الواقف كنص الشارع. واقف کی شرط شارع علیہ الصلاۃ والسلام کے نص و حدیث کی طرح ہے۔

لہٰذا جب وقف کرنے والے خالد نے پانی کا بور کرایا اور یہ کہہ دیا کہ: ”اس بور کا استعمال مسجد و مدرسہ کے لیے کیا جائے“ تو درج بالا فقہی ضوابط کے مطابق مسجد و مدرسہ کے سوا کسی اور جگہ کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں کہ یہ غرضِ واقف، نیز شرط واقف کے خلاف ہے۔ متولی فوراً اس تصرفِ بے جا سے باز آئیں اور جتنے دنوں تک وقف کا بور اور

مسجد کی بجلی اپنے نجی کام کے لیے استعمال کی ہے، اتنے دنوں کی اجرت دیں، فتاویٰ عالم گیری کے اس جزئیہ سے یہاں روشنی ملتی ہے۔

بہارِ شریعت میں ہے:

"مکان موقوف کو عاریت دینا، بغیر کرایہ کسی کو رہنے کے لیے دے دینا ناجائز ہے۔ اور رہنے والے کو کرایہ دینا پڑے گا۔"

(بہارِ شریعت، دہم، ص:۱۰۸، مطبوعہ بریلی)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲-۳-۴) درج بالا جواب میں ان امور کا جواب بھی شامل ہے، اسے بغور ملاحظہ کریں۔ یہ متولی فوراً اپنی خیانت سے باز آئیں، بور اور بجلی کے استعمال پر اجرت مثل ادا کریں اور علانیہ تائب ہو کر عہد کریں کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ اگر ایسا کر لیں تو ٹھیک، ورنہ انھیں منصب تولیت سے معزول کر کے کسی امانت دار ثقہ کو متولی بنائیں۔

بہارِ شریعت میں در مختار وغیرہ کے حوالے سے ہے۔

"متولی اگر امین نہ ہو خیانت کرتا ہو یا کام کرنے سے عاجز ہے... یا کوئی دوسرا فسق علانیہ کرتا ہو... تو اس کو معزول کر دینا واجب ہے، اگر قاضی نے اس کو معزول نہ کیا تو قاضی بھی گنہ گار ہے۔"

(بہارِ شریعت، دہم، ص:۹۶، مطبوعہ بریلی)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پتنگ بنانے اور خرید و فروخت کرنے کا حکم

آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، معاشی اور اقتصادی حالت ابتر ہوئی ہے، بڑے بڑے کاروبار جینیوں، اگروال، سندھی اور پنجابی کے ہاتھ میں ہیں، مسلمانوں کے پاس چھوٹے کاروبار ہیں اور ملازمت بھی نہیں ملتی ہے، پتنگ اور آتش بازی کے خلاف مفتیانِ کرام کا فتویٰ ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو آنکھ، کان، زبان، یا ہاتھ پیر سے معذور ہیں، ان کے لیے کیا اسلام نے کوئی رعایت دی ہے؟

بچپن سے میری بینائی کم ہے، میری آنکھوں میں رٹاینائنس پگمنٹ ٹنوسا نام کی خاندانی بیماری ہے، میری بینائی اتنی کم ہو گئی ہے کہ بازو کے آدمی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

میں پتنگ، دھاگہ مانجھا کا کاروبار کر رہا ہوں۔ تین چار مہینے کا سیزن ہوتا ہے، ۹۰ر فیصد گراہک غیر مسلم ہوتے ہیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب

پتنگ سے اصل مقصود لہو و لعب ہے، بلکہ اسی کے لیے وہ تیار کی جاتی ہے، لہٰذا پتنگ بنانا، بیچنا، خرید نا سب ناجائز و گناہ ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كل لهو مسلم باطل الا ثلٰث.

جد الممتار میں ہے:

فاعلم أن معنى "ما تقوم المعصية بعينه" أن يكون في أصل وضعه موضوعا أو تكون هي المقصودة العظمى منه فإنه إذا كان كك يغلب على الظن ان المشتري إنما يشتريه لإتيان المعصية، لأن الأشياء إنما تقصد للإستمتاع بها، فما كان مقصوده الأعظم تحصيل معصية، معاذالله. كان شراؤه دليلاً واضحًا على ذٰلك القصد فيكون بيعه اعانة على المعصية لما علمت من التعين بقصد القاصد. (جد الممتار، ج:۷/ ص:۷۷)

البتہ یہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھوں پتنگ بیچنے کی اجازت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نقد و ادھار اور تعلقات کے سبب سامان کی قیمت کم و بیش کرنے کا حکم

زید و بکر مرچ کا کاروبار الگ الگ کرتے ہیں، بکر نے زید سے دس لاکھ روپے بطور قرض اس شرط کے ساتھ لیے کہ میں اب آپ سے مرچ مارکیٹ کے ریٹ سے دو، تین روپے کم میں فروخت کروں گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟ دلائل سے مزین تحقیقی جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

تاجر سامان کا دام نقد و ادھار کی وجہ سے اور تعلقات ہونے نہ ہونے کی وجہ سے کم و بیش کر دیتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، یہ جائز ہے، لیکن صورت مسئولہ میں ظاہر یہ ہے کہ بکر نے قرض کے دباؤ کی وجہ سے قرض خواہ کے لیے دو، تین روپے ریٹ کم کیا ہے، اگر اس کی صورت یہ ہو کہ بکر دو تین روپے کی یہ رعایت قرض خواہ کے لیے نہ کرتا تو وہ اسے قرض نہ دیتا، یا وہاں کا عرفِ عام ہی ایسا ہو تو قرض خواہ کے حق میں یہ دو تین روپے سود ہوئے اور سود لینا حرام و گناہ ہے۔ اور اگر وہاں ایسا کوئی عرفِ عام نہ ہو اور نہ ہی قرض خواہ کی طرف سے ایسا کوئی دباؤ، نہ اشارہ، بکر نے قرض کے روپے وصول کر لیے اس کے بعد محض اپنی رضا سے احسان کے بدلے کے طور پر اس نے احسان کی بات کہی تو یہ جائز ہے۔ تاہم اس صورت میں بھی احتیاط یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہ کہے۔ البتہ مرچ بیچتے وقت جو جی میں آئے وہ رعایت کر دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخلیق کائنات

سائنسی حقائق آیات قرآنی کی روشنی میں

محمد اسحاق اکبری نقشبندی

انسان نے ہمیشہ سے تفہیم کائنات اور وجہ تخلیق کائنات کی پوشیدہ سائنسی حقائق کو جاننے میں دلچسپی ظاہر کی ہے جس کے نتیجے میں متعدّد حیران کن انکشافات سامنے آئے جن میں کائنات کی اجزائے ترکیبی، اس کے ارتقائی منازل کی تاریخ، اس پر واقع طبی خدوخال اور قدرتی وسائل و خوراک کی موجودگی کا علم سر فہرست ہے۔ پھر جب سائنسی علوم نے مزید ترقی کی منازل طے کیں تو انسان اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ کائنات میں موجود یہ زمین، سورج، ریگستان، دریا اور سمندر کو یوں ہی بلا کسی منصوبے اور مقصد کے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ایک منظم اور باقاعدہ سائنسی قوانین کے تحت اس کی تخلیق ہوئی ہے اور یہ کہ زمین و سمندر میں ایسے قیمتی خزانے مخفی رکھے گئے ہیں جس پر کسی بھی ملک اور قوم کی معیشت کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اب دنیا تسلیم کرتی ہے کہ جس ملک کے پاس جتنی زیادہ قدرتی وسائل کی موجودگی ہوگی وہ اتنا ہی زیادہ مظبوط اور مستحکم ہوگا۔ لیکن اب اس کا کیا کرنا کہ خود انسان ہی اپنے مختلف طرز عمل کے ذریعے کائنات کے اصلی تخلیقی رنگ و بو، ماحول اور وسائل کو برباد کر رہا ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات آلودہ اور کثیف ہوتی چلی جا رہی ہے اور اس کے قدرتی ماحول میں غیر متوازن کیفیات پیدا ہو رہی ہے جو نہ صرف خطرات بلکہ خوفناک ہلاکت کا سامان مہیا کر سکتا ہے۔

آئیے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ تفہیم و تخلیق کائنات کے مخفی سائنسی حقائق کیا ہے؟ پھر یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد کائنات کے قدرتی وسائل اور متوازن ماحول پر کیا منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ کائنات آلودگی کی زد میں آچکی ہے اور اس پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ لیکن سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قرآنی علم تفہیم و تخلیق کائنات کے بارے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ تو اس سلسلے میں قرآن مجید میں جابجا یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگر رات و دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے جن کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالی کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی اور آسمان و زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تونے اس کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا

[آل عمران آیت ۱۹۰۔۱۹۱]

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جدید سائنسی علوم جو حالیہ صدی میں منظر عام پر آئے ہیں قرآنی آیات میں ان سائنسی حقائق کو آج سے تقریباً چودہ صدیوں پہلے بیان کر دیا گیا تھا اور قرآن مجید نے قریب ۷۵۰ مقامات پر کائنات کے سائنسی حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن ہمارا جدید تعلیمی نظام اس نقطۂ نظر سے کہیں دور نظر آتا ہے۔ حالانکہ کائنات کا سائنسی علم ہم مسلمانوں کی میراث ہے لیکن افسوس! کچھ صدیوں قبل ہم اسے فراموش کر چکے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو سائنسی علوم خصوصاً ارضی علوم اور قرآنی علم میں بڑا گہرا ربط رہا ہے۔

اس سائنسی ربط کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے کائنات کی وسعت کا جائزہ لینا ہوگا کیونکہ وسعت کائنات ہی دراصل تفہیم کائنات ہے کائنات کو ہم مجموعی طور پر زمین و آسمان کے معنی میں لیتے ہیں جو پہاڑ، سمندر، دریا، ریگستان، گلیشیر اور سورج، چاند، ستارے، سیارے اور شہاب ثاقب وغیرہ پر بالترتیب مشتمل ہوتے ہیں۔ اسی طرح کائنات میں سرگرم خلیے کی بھی درجہ بندی ہو جائے گی مثلاً کرۂ فضا میں تبخیری تکثیفی عمل کار فرما ہے جس کی وجہ سے بادل، بارش، برفباری ہوتی ہے۔ لیکن کرہ فضا کے انتہائی بالائی جانب یعنی سطح زمین سے ۷۰ کلومیٹر اوپر جو کائنات موجود ہے وہ آئن شدہ گیسوں پر مشتمل ہے اسے کرہ آئن کہا جاتا ہے۔ اس سے مزید اوپر کی جانب جو کائنات موجود ہے اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی محدود ہے اس کے بارے میں صرف یہی کہا جاتا ہے کہ وہ بلند تپش والے حصے ہیں جہاں

زندگی ناممکن ہے یہاں زیادہ تر ایٹمی تصادم ہوتا رہتا ہے۔ بنیادی طور پر کائنات کے یہ حصے آسمان کہلاتے ہیں۔ ٹھیک یہی کیفیت ہماری زمین کی بھی ہے یہاں پر بعض سرگرم عوامل دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں مثلاً ہوا، پانی اور برف زمین کے وہ کارندے ہیں جو ہر لمحہ کرہ ارض پر سرگرم ہیں لیکن زمین پر بعض عوامل خفیہ طور پر بھی سرگرم ہیں مثلاً دباؤ اور درجہ حرارت وہ کارندے ہیں جو زمین کے اطراف توانائی کو مرکوز کرتا رہتا ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آتے البتہ زلزلہ، آتشفشاں اور کوہ سازی کے دوران اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ پھر دوسری جانب کرہ ارض کا ۷۲٪ حصہ پانی کی لپیٹ میں ہے یہ "سمندر" ہے۔

گویا پوری کائنات خداوندی تین حصوں پر مشتمل ہے یعنی آسمان، زمین اور سمندر۔ اسی بنیاد پر کائنات کی دو قسمیں سامنے آتی ہیں۔

بیرونی کائنات:۔ سطح سمندر اور زمین کے اطراف اور بالائی جانب (عمودا) مختلف اقسام کی گیس، گرد و غبار، نمی اور باریک تر ذرات آمیزے کی صورت میں موجود ہیں یہ "فضائی غلاف" ہے جس نے سمندر و زمین کے بالائی حصوں کو اپنے محیط میں لے رکھا ہے۔ یہی بیرونی کائنات ہے جو اوپر کی جانب بتدریج مختلف پرتوں پر مشتمل پائی گئی ہے۔ ان طبقات کے درمیان ایک ایسا حفاظتی طبق بھی موجود ہے جسکی وجہ سے زمین پر حمد و ثنا کا ورد جاری ہے جس کا ذکر نیچے آئے گا۔ اس حفاظتی طبق یا پرت کے اوپر سورج اور پھر دیگر سیارے موجود ہیں۔ آسمان کی طبقبندی کے بارے میں قرآن مجید نے بہت پہلے ہی ارشاد فرمادیا تھا جس کا اندازہ سائنس نے بہت بعد میں لگایا۔

اندرونی کائنات:۔ زمین اور سمندر کے اندرونی حصے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے لیکن معاشی اعتبار سے بہت سود مند ہیں۔ کیونکہ جدید تحقیق کے بعد یہ انکشاف ہوا ہے کہ ایک مخصوص درجہ حرارت اور دباؤ یعنی گہرائی میں بیکٹیریا کی وہ اقسام پائی جاتی ہے جو تیل و گیس یعنی پیٹرولیم کی تخلیق میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ بیکٹیریا کی وہ اقسام ہیں جو بغیر آکسیجن کے زندہ رہتی ہیں اور تعمیری کام سرانجام دیتی ہیں انھیں تخفیفی بیکٹیریا بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تخفیفی ماحول میں سرگرم ہوتے ہیں۔ یہ خوردبینی بیکٹیریا نہایت سست رفتار کے ساتھ ان نباتات اور حیوانات کو جو اپنا دور حیات مکمل کرنے کے بعد زمین میں دفن ہو جاتے ہیں اثرانداز ہو کر تعمیری نقطہ نظر سے انھیں گلنے سڑنے کے بجائے "سیاہ کوڑوں" میں تبدیل کر دیتے ہیں جو بعد میں ایک لمبی مدت اور پیچیدہ مرحلوں سے گزرنے کے بعد تیل و گیس یعنی پیٹرولیم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ "سیاہ کوڑوں" سے تیل و گیس کی تخلیق کا انکشاف ارضی علوم نے حتمی طور پر ہمارے دور میں کیا لیکن قرآنی علم نے چودہ صدیاں قبل اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں اس سلسلے میں قرآن مجید کیا ارشاد فرماتا ہے؟ "جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی، جس نے نباتات اگائی پھر ان کو سیاہ کوڑا میں تبدیل کیا" (الاعلی)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی فرماتا ہے ہر چیز کو توازن کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ مختلف نباتات و حیوانات کو اس کے نشونما کی مناسبت سے متوازن آب و ہوا میں پیدا کیا پھر فوراً ارشاد ہوتا ہے کہ "سیاہ کوڑا" میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے سیاہ کوڑے کے معنی ایسی مٹی کے ہیں جس میں نباتاتی و حیواناتی اجزاء شامل ہو۔ گویا ایسی مٹی سیاہ کوڑوں کے باریک اجزاء کا آمیز ہوتا ہے۔ علم پیٹرولیم کے نقطہ نظر سے ایسی مٹی جس میں نامیاتی اشیاء کی شمولیت ہو جائے "سیاہ پٹی" میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے علم پیٹرولیم کی زبان میں "بلیک تیل" کہتے ہیں۔ موجودہ دور میں ارضی علوم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تیل و گیس کی تخلیق نامیاتی طریقوں سے ہوئی ہے جو ابتدا میں سیاہ کوڑوں کی شکل میں موجود ہوتا ہے اور بعد میں چٹانوں کے مساموں داخل ہو کر "لیک شیل" کہلاتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ آیت بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مذکورہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ جس نے حیوانات اور نباتات پیدا کیے پھر انھیں گلا سڑا کر ختم کر دیا بلکہ قرآنی آیت یہ کہہ کر ہمیں سوچنے کی دعوت دیتی ہے کہ ہم نے ان کو "سیاہ کوڑوں" میں تبدیل کر دیا۔ گویا سیاہ کوڑا نامیاتی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے اور تمام نامیاتی اشیاء اس وقت سیاہ کوڑا میں تبدیل ہو سکتی ہیں جب اسے تخفیفی ماحول میسر آجائے یہ ماحول نامیاتی اشیاء کو گلنے سڑنے نہیں دیتے بلکہ مختلف تعاملات کے بعد سیاہ کوڑا کو "سیاہ سیال" میں تبدیل کرتے جاتے ہیں جو پیٹرولیم کی تشکیل میں خام مال کا کام انجام دیتا ہے۔ قرآنی آیات نے جس چیز کو کوڑا کہا ہے علم پیٹرولیم نے اسے سیاہ سیال کا نام دیا ہے اور کیمیائی طور پر ہائیڈرو کاربن کہلاتا ہے۔ یاد رہے کہ جدید سائنسی علوم میں کوڑا مائع، گیس اور ٹھوس تینوں حالتوں کا نام ہے۔ ابتدا میں

حیوانات اور نباتات کے اجزاء ٹھوس حالت میں ہوتے ہیں جو سیاہ کوڑا کہلاتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف کیمیائی عمل کے بعد یہ مائع اور گیس کوڑا میں تبدیل ہوکر پیٹرولیم کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

دوسری طرف بند فضا میں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جہاں ہماری آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی وہاں قرآن مجید خوردحیاتی کیڑے، حشرات اور گراں قدر آب خلقت کا ذکر کرتا ہے جس سے کائنات کا ایک الگ رنگ اور حیات کا حیران کن منظر سامنے آتا ہے۔

"سورہ رحمن کی آیت ۱۹ تا ۲۵ میں "اللہ تعالی نے اسی قسم کی مخلوق کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر سائنسی نقطہ نظر سے چودہ صدیوں کے بعد جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں اسی قسم کی مخلوق کا ذکر آیا ہے۔ علاوہ ازیں سمندر کی عمیق گہرائی میں گراں قدر معدنیات اور قدرتی خوراک کا ذکر بھی قرآن مجید میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں طبقات ارض کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق سمندری پانی میں دھاتوں اور معدنیات کی بھاری مقدار حل شدہ حالت میں موجود پائی گئی ہے جسے تجارتی بنیادوں پر نکالا جاسکا ہے۔ اس کے علاوہ تیل و گیس، فاسفورس، نمک میگنیز اور بیش قیمتی پتھر کی بھاری مقدار سمندر سے نکالی جاسکتی ہے۔ اسی کو قرآن مجید نے چودہ صدی قبل اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے لیے مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے غزا کے لیے مچھلی حاصل کرو، تاکہ تم اس سے جواہرات نکال کر اپنے استعمال میں لاو اور آپ دیکھتے ہیں کہ سمندری جہاز موجوں کو چیرتے ہوئے چلتے ہیں تاکہ تم تجارتی مال واسباب کے کاروبار سے فائدہ حاصل کرو اور تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بندے بن جاو" (سورہ نحل)

اس طرح پوری کائنات کو تخلیق اور حیات کی بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) سورج اور اس کا زیریں حصہ
(۲) زمین اندرونی و بیرونی
(۳) سمندر اندرونی و بیرونی

قرآن مجید نے ان تینوں جز کے باہمی ربط کو یوں بیان فرمایا ہے "اس کی ملک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں اور جو چیزیں زمین کی تہ میں ہیں"

کائنات کے یہ تینوں جز دراصل پوری کائنات کو اپنے محیط میں لیے ہوئے ہیں۔ مثلا سمندر کا پانی سورج کی خدمت سے تبخیری عمل کے بعد ابر بنتا ہے جو فضا کے گرد معلق ہوکر بارش کی شکل اختیار کرتا ہے بارش کی کل مقدار کا ایک حصہ دوبارہ سمندر میں پہنچ جاتا ہے جو تبخیری عمل کی زد میں آکر دوبارہ بخارات میں تبدیل ہوتا رہتا ہے جب کہ دوسرا حصہ زیر زمین ہوکر ذخیرہ اندوز پانی کی شکل اختیار کرتا ہے جو بعد میں پینے کے پانی کے طور پر استعمال میں آتا ہے۔ اس طرح کائنات میں یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے اسے "کائنات کا آبی چکر" کہتے ہیں جو بارش کا باعث بنتی ہے۔ اور یوں ہماری کائنات ہر دم سرسبز و شاداب رہتی ہے گویا یہ عمل بے جان زمین میں جان ڈال دیتا ہے۔ آبی چکر اور اس سے منسلک دیگر سرگرمیاں تو محض چند صدی قبل ہی کی سائنسی دریافت ہے جبکہ قرآن مجید میں اس کی وضاحت پہلے ہی موجود ہے۔

"آپ ان مشرکین سے کہیئے وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے" (سورہ یونس)

اس آیت کریمہ میں پورے "آبی چکر" کا ذکر ہے کیونکہ سمندری پانی گرم ہوکر بخارات بنتا ہے اور بھاپ کی شکل میں آسمان تک پہنچتا ہے پھر عمل کثیف سے بادل کی تشکیل ہوتی ہے جو معلق حالت میں مختلف ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے انہی ٹکڑوں سے بارش ہوتی ہے جو مخلوق کے لیے رزق کا باعث بنتی ہے۔

"جس (اللہ) نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ سے مردہ زمین میں جان ڈال دی" (سورہ زخرف)

☆☆☆

ماھنامہ اشرفیہ حاصل کریں

بلرام پور میں

مولانا محمد حارث مصباحی صاحب

مدرسہ عربیہ فیض العلوم

پپرا بنگڑھ، پوسٹ امواباس، وایا جاروا، ضلع بلرام پور (یوپی)

سیتامڑھی میں

رضا بک ڈپو

مقام و پوسٹ پریہار، ضلع سیتامڑھی (بہار)

مدعیِ نبوت مرزا قادیانی پر اولین فتویٰ کفر کی تحقیق

محمد ثاقب رضا قادری

۷۔ مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ میں براہین احمدیہ کی اشاعت کے لیے مرزا قادیانی کی مالی اعانت کے لیے اشتہار شائع کیے۔ اشتہار کا عکس دیکھنے کے لیے کتاب تاریخ ختم نبوت: ۸۳ ملاحظہ کریں۔ (اشاعۃ السنۃ کا مکمل ریکارڈ دفتر رسالہ "محدث" واقع ماڈل ٹاؤن لاہور کی لائبریری سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے اور ہدیۃً حاصل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مکمل ریکارڈ کی فوٹو کاپی مولانا احمد علی قصوری (مسلم ٹاؤن، لاہور) کے ذاتی ذخیرہ میں موجود ہے۔ جہاں سے ہم نے استفادہ کیا۔)

۸۔ براہین احمدیہ کی اشاعت کے لیے مولوی بٹالوی مرزا قادیانی کو اپنے مشوروں سے بھی نوازتے رہے چنانچہ ملاحظہ ہو رسالہ اشاعۃ السنۃ جلد ۳، شمارہ ۹ ص ۳/۴ بہ حوالہ کتاب تاریخ ختم نبوت، ص: ۸۸)

۹۔ مرزا قادیانی اور مولوی بٹالوی کے باہمی اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولف تاریخ ختم نبوت نے ص: ۱۰۲ پر کلام کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ براہین احمدیہ و دیگر کتب کے نام پر مسلمانوں سے بٹوری گئی رقم (تقریباً دس ہزار روپے) کی تقسیم سے رنجش کا آغاز ہوا چوں کہ مرزا قادیانی نے تمام رقم خود ہی رکھ لی تھی۔ اس حوالہ سے مولوی بٹالوی نے اشاعۃ السنۃ کی متعدّد اشاعتوں مثلاً جلد ۱۵، شمارہ نمبرا کے ص ۱۰، جلد ۱۵، شمارہ نمبر ۹ کے ص ۲۰۷ اور جلد ۱۶، شمارہ نمبر ۷ کے ص ۲۱۱ پر مرزا قادیانی سے ان دس ہزار روپیوں کی بابت کم و بیش ایک ہی مفہوم کی عبارت لکھی ہے۔ ہم جلد ۱۶ کی عبارت یہاں نقل کرتے ہیں:

"کون سی کتاب میں اس (مرزا قادیانی) نے اسلام کی پوری تائید کی ہے، کتاب براہین احمدیہ میں اس نے بیان تین سو (۳۰۰) دلائل حقیت اسلام کا جھوٹا وعدہ دے کر اور خلاف واقعہ طمع دلا کر دس ہزار سے زائد روپیہ مسلمانوں کا کھینچا اور خورد برد کیا اور اس کتاب میں ایک دلیل بھی پوری بیان نہ کی اور نہ دس برس کے عرصہ میں کتاب چھپوائی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور اس کے دلائل ہنوز در بطن شاعر کا مصداق ہے۔ ہاں ان کارروائیوں سے فائدہ ہے تو اس کی ذات خاص کو ہے کہ وہ دس ہزار روپیہ سے زائد لوگوں کا مال کھا کر اس بڑھاپے میں خوب موٹا و تازہ بن گیا ہے۔ (اشاعۃ السنۃ جلد ۱۶، شمارہ ۷، ص: ۲۱۱ بہ حوالہ تاریخ ختم نبوت: ۱۰۴)

اختلاف کی ایک وجہ قادیانی مؤرخ دوست محمد شاہد اپنی کتاب تاریخ احمدیت میں لکھتا ہے: "انہیں (بٹالوی صاحب کو) غصہ اس بات پر تھا کہ مجھ سے اپنے دعوی سے متعلق آپ (مرزا قادیانی) نے مشورہ کیوں نہیں کیا۔" (تاریخ احمدیت، جلد ۲، ص: ۱۹۰)

۱۰۔ مولوی بٹالوی نے مرزا قادیانی کی جس قدر شدت سے حمایت کی، اس کے فوائد و ثمرات مرزا قادیانی کو کیا حاصل ہوئے نیز کس حلقہ میں زیادہ مرزا قادیانی کی قبولیت بڑھی چناں چہ اس بارے مولوی بٹالوی لکھتے ہیں:

"اشاعۃ السنۃ کا ریویو (یعنی براہین احمدیہ پر تائیدی ریویو) اس (مرزا قادیانی) کو امکانی ولی و ملہم نہ بناتا تو وہ اپنے سابقہ الہامات مندرجہ براہین احمدیہ کی وجہ سے تمام مسلمانوں کی نظروں میں بے اعتبار ہو جاتا۔ کیوں کہ بہت سے علماء مختلف دیار ہندوستان و پنجاب و عرب کا ان الہامات کے سبب اس کی تکفیر و تفسیق و تبدیع پر اتفاق ہو چکا تھا۔ صرف اشاعۃ السنۃ کے ریویو نے فرقہ اہل حدیث اور اپنے خریداروں کے خیال میں اس کے الہام کا امکان جما رکھا تھا اور اس کو حامی اسلام بنا رکھا تھا۔ لہذا اسی اشاعۃ السنۃ کا فرض اور اس کے ذمہ قرض تھا کہ اس نے جیسا اس کو دعاوی قدیمہ کی نظر سے آسمان پر چڑھایا تھا ویسا ہی ان دعاوی جدیدہ کی نظر سے اس کو زمین پر گرا دے اور تلافی مافات عمل میں لاوے اور جب تک یہ تلافی پوری نہ ہو لے تب تک بلا ضرورت شدید کسی دوسرے مضمون سے تعرض نہ کرے۔"

(اشاعۃ السنۃ جلد ۱۳، شمارہ نمبرا، ص: ۳۔۴ بابت ۱۳۰۸ھ، ۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء)

سطور بالا سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مولوی بٹالوی نے ۱۸۹۰ء میں مرزا قادیانی کی مخالفت شروع کی۔ براہین احمدیہ کی اشاعت ۱۸۸۰ء میں شروع ہوئی، یوں مولوی بٹالوی براہین احمدیہ کی اشاعت کے بعد دس برس تک مرزا قادیانی کے بھرپور حامی رہے اور اس کا دفاع کرتے رہے۔

۱۱۔ ڈاکٹر بہاء الدین کے بقول مولوی بٹالوی نے ۱۸۹۲ء میں مرزا قادیانی کے متعلق مولوی سید نذیر حسین دہلوی سے استفتا کر کے فتوی لکھوایا اور دیگر علمائے پنجاب و ہندوستان کی تصدیقات حاصل کر کے اشاعۃ السنۃ کی جلد ۱۳ میں شائع کیا۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے متعلق مزید بھی بہت سی نئی معلومات دیوبندی مصنف جناب ابن انیس حبیب الرحمن لدھیانوی نے لکھی ہیں لیکن ہمارے عنوان کے لیے اس قدر ہی کافی ہے۔

۴۔ علمائے لدھیانہ کا فتویٰ تکفیر: لدھیانہ کے علماء نے مرزا قادیانی کے متعلق فتویٰ تکفیر ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں جاری کیا۔ اس موقف کا بنیادی ماخذ فتاوی قادریہ ہے جو کہ لدھیانہ کے علماء مولوی محمد لدھیانوی اور مولوی عبداللہ لدھیانوی اور مولوی عبدالعزیز لدھیانوی کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ یہ فتاوی مولوی محمد لدھیانوی کے اہتمام سے ربیع الاول ۱۳۱۹ھ مطابق جون ۱۹۰۱ء مطبع قیصر ہند، لدھیانہ میں طبع ہوا۔ یہ کتاب ایک عرصہ تک نایاب رہی تا آں کہ مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے اس کی عکسی اشاعت مکتبہ قادریہ لاہور سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کی۔ اسی فتاوی قادریہ کی بنا پر مولوی ابن انیس حبیب الرحمن لدھیانوی نے ایک کتاب بنام "سب سے پہلا فتویٰ تکفیر" تحریر کی جس میں پہلی بار یہ موقف نمایاں کیا گیا کہ مرزا قادیانی کے ارتداد پر پہلا فتویٰ کفر علماء لدھیانہ نے دیا۔ یہ کتاب رئیس الاحرار اکیڈمی فیصل آباد سے جولائی ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔ اس موقف کا بنیادی محرک فتاوی قادریہ کی یہ عبارات ہیں:

"مرزا غلام احمد قادیانی نے شہر لودیانہ میں آکر ۱۳۰۱ ہجری میں دعویٰ کیا کہ میں مجدد ہوں ..... جس روز قادیانی شہر لودیانہ میں وارد ہوا تھا راقم الحروف اعنی محمد و مولوی عبداللہ و مولوی اسمٰعیل نے براہین کو دیکھا تو اس میں کلمات کفریہ انبار در انبار پائے اور لوگوں کو قبل از دوپہر اطلاع کر دی گئی کہ یہ شخص مجدد نہیں بل کہ زندیق اور ملحد ہے اور گرد و نواح کے شہروں میں فتوے لکھ کر روانہ کیے گئے کہ یہ شخص مرتد ہے اس کی کتاب کوئی خرید نہ کرے۔ اس موقع پر اکثر نے تکفیر کی رائے کو تسلیم نہ کیا بل کہ مولوی رشید احمد گنگوہی نے ہماری تحریر کی تردید میں ایک طومار لکھ کر ہمارے پاس روانہ کیا اور قادیانی کو "مرد صالح" قرار دیا اور ایک نقل اس کی مولوی شاہ دین و مولوی عبدالقادر اپنے مریدوں کے پاس روانہ کی چناں چہ مولوی شاہ دین نے بر سر بازار روبرو مریدان منشی احمد جان و متبعان قادیانی یہ کہہ کر مولوی رشید احمد صاحب نے مولوی صاحبان کی تردید میں یہ تحریر ارسال فرمائی ہے پھر اس کے اٹکل پچو معنی کر کے زور شور کے ساتھ سنایا۔

مولوی عبدالعزیز نے اس تحریر کی بروز جمعہ وعظ میں خوب دھجیاں اُڑائیں۔ مولوی عبداللہ کو اس تحریر کا حال سن کر نہایت فکر ہوا کہ مولوی رشید احمد نے ایسے مرتد کو "مرد صالح" کیسے لکھ دیا، جناب باری میں دعا کر کے سو گئے۔ خواب میں معلوم ہوا کہ تیسری شب کا چاند بد شکل ہو کر لٹک پڑا، غیب سے آواز آئی کہ رشید احمد یہی ہے۔ اسی روز سے اکثر فتوے ان کے غلط مناقض یکے بادیگرے حیز وجود میں آنے لگے اور اس تحریر کی راقم الحروف نے یہ تردید لکھی ہے... (اتنا لکھنے کے بعد مولوی محمد لدھیانوی نے "انطباق العنوانین علی المعنونین" کے عنوان سے مولوی رشید احمد گنگوہی کی تحریر در حمایت مرزا کی بھرپور تردید کی ہے۔) (تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاوی قادریہ: ۱۔۴)

مزید صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں: "پھر اس تحریر (یعنی مولوی رشید گنگوہی کے فتوی کی تردید والی تحریر) کو ہم تینوں ساتھ لے کر جلسہ دستار بندی مدرسہ دیوبند بتاریخ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ میں پہنچے، دوسرے روز مولوی رشید احمد صاحب ملاقات کے واسطے تشریف لائے۔ بعد ازاں مولوی محمد یعقوب صاحب بھی براہ مہمان نوازی ملنے کو آئے، راقم الحروف نے کچھ حال قادیانی کا بہ طور اجمال زبانی بیان کیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اگر بہ طور ظلیت آں حضرت ﷺ اس پر ورود الہامات کا ہوتا ہو تو کیا عجب ہے!!! میں نے کہا کہ اگر اہل کتاب یہود و نصاریٰ یہ اعتراض کریں کہ جیسا قادیانی پر بہ سبب ظلیت آیات قرآنی نازل ہو رہے ہیں ایسا ہی تمھارے پیشوا خود مستقل پیغمبر نہیں تھے بل کہ بہ سبب اتباع ابراہیم علیہ السلام کے ان پر قرآن بہ طور الہام نازل ہوا ہو گا تو پھر آپ کیا جواب دو گے۔ مولوی صاحب نے لاجواب ہو کر یہ فرمایا کہ میں اس شخص کو غیر مقلد جانتا ہوں اور آپ کو اس کی تکفیر سے منع نہیں کرتا کیوں کہ آپ اس کے کل حالات سے بہ سبب قریب الوطن ہونے کے واقف ہیں اور نیز آپ نے اس کی کتاب براہین کی ہر چہار جلد کو دیکھ لیا ہے۔

بعد ازاں ہم نے تحریر مذکورۃ الصدر کو بتاریخ ۱۴ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ مولوی رشید احمد کی خدمت میں بر سر عام جس میں مولوی محمد مظہر مرحوم وغیرہ علما و فضلائے نامدار موجود تھے۔ پیش کیا آپ نے فرمایا کہ مجھ کو جہاں تک آتا تھا آپ کی خدمت میں لکھ کر روانہ کر دیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ کی تحریر پر اعتراضات وارد کیے گئے ہیں ان کو ملاحظہ فرما کر جواب سے مشرف فرما دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو جہاں تک علم تھا میں نے لکھ دیا تھا، زیادہ اس سے مجھ کو علم نہیں ہے۔ مولوی عبداللہ نے دوبارہ اس تحریر کو مولوی صاحب کے ہاتھ دے کر آیت "واما السائل فلا تنھر" پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کا جواب عنایت فرما دیں۔ مولوی صاحب نے تحریر کو واپس دے کر فرمایا کہ ہمارے سب کے مولانا محمد یعقوب بڑے ہیں، اس باب میں جو ارشاد کریں مجھ کو منظور ہے۔ مولوی عبداللہ نے کھڑے ہو کر بآواز بلند فرمایا کہ جو لوگ اس مسئلہ خاص میں اپنا دین تباہ کر رہے ہیں اس کا وبال آپ کی گردن پر ہو گا یا ہماری گردن پر؟؟

بعد ازاں ہم وہاں سے روانہ ہو کر مولانا محمد یعقوب کی خدمت میں

پہنچے ،فوراً مولوی رشید احمد کے بڑے صاحب زادہ نے مع گروہ کثیر جس میں چند عالم مثل مولوی محمود حسن مدرس مراد آباد وغیرہ داخل تھے -آکر شوروغل مچایا۔ مولانا یعقوب نے فرمایا کہ سب کے سب شور مت کرو صرف ایک شخص کلام کرے۔ مولوی محمود حسن نے بیان کیا کہ یہ تینوں مولوی تین روز سے پکار رہے ہیں کہ مرزاغلام احمد قادیانی کافر اور جو اس کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے میں نے کہا کہ یہ امر غلط ہے۔ فریق ثانی نے کہا کہ اب انکار کرتے ہیں میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ وہ کون شخص ہے جس سے ہم نے خوف کھا کر انکار کیا ہمارا اول سے یہی عقیدہ ہے کہ قادیانی کافر اور جو شخص اس کا ہم عقیدہ ہے وہ بھی کافر ہے جس کو حوصلہ گفتگو کا ہو وہ میدان گفتگو میں آکر کسی ثالث کے مکان پر بحث کرلے اس مکان پر بحث کرنے کا موقع نہیں کیوں کہ یہاں پر یہ مثل مشہور صادق آرہی ہے ایک ناک والا سات ناک کٹوں کے پاس جب پہنچا فوراً سب کے سب اول ہی بول اٹھے کہ ناکو آیا-یہ کلام سن کر سب خاموش ہو گئے کسی نے گفتگو کرنے کا نام بھی نہ لیا۔ پھر میں نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے عرض کیا کہ جو آپ نے کل بوقت ملاقات قادیانی کے باب میں فرمایا تھا اس کو تحریر بھی کردو گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ بھی لکھ دوں گا کہ اس کے الہامات اولیاء اللہ کے الہامات سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے لیکن فی الحال بہ سبب کاروبار جلسہ کے مجھ کو فراغت نہیں، دو تین روز کے بعد لکھ کر روانہ کردوں گا یا آپ میری طرف سے تحریر کرلینا چناں چہ مولانا صاحب نے حسب وعدہ کے ایک فتوی اپنے ہاتھ سے لکھ کر ہمارے پاس ڈاک میں ارسال فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ یہ شخص میری دانست میں غیر مقلد معلوم ہوتا ہے اور اس کے الہامات اولیا اللہ کے الہامات سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اور نیز اس شخص نے کسی اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر فیض باطنی حاصل نہیں کیا۔ معلوم نہیں کہ اس کو کس روح کی اویسیت ہے۔

اور شاہ عبدالرحیم سہارن پوری نے بروقت ملاقات فرمایا کہ مجھ کو بعد استخارہ کرنے کے یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص بھینسے پر اس طور سے سوار ہے کہ مونھ اس کا دُم کی طرف ہے جب غور سے دیکھا تو زُنّار اس کے گلے میں پڑا ہوا نظر آیا جس سے اس شخص کا بے دین ہونا ظاہر ہے اور یہ بھی میں یقیناً کہتا ہوں کہ جو اہل علم اس کی تکفیر میں اب متردد ہیں کچھ عرصہ بعد سب کافر کہیں گے۔

قاری عبدالکریم نے بھی اس کو سخت ملحد اور زندیق تحریر کیا۔"

(ایضاً:۱۵-۱۷)

یہاں تک حال علماء لدھیانہ کے فتویٰ تکفیر ۱۳۰۱ھ کا بیان ہوا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ فتاوی قادریہ میں مولوی محمد لدھیانوی نے اپنے اس فتوی کی اصل تحریر کو شامل نہیں کیا حالاں کہ فتاوی کے مجموعہ میں اس کو ضرور شامل ہونا چاہیے تھا البتہ مولوی رشید گنگوہی نے جو تحریر فتوی کفر کی تردید میں لکھی تھی اس کے رد والی تحریر کو فتاوی میں شامل کیا ہے۔ مولوی ابن انیس حبیب الرحمن لدھیانوی بھی اپنی کتاب "سب سے پہلے فتویٰ تکفیر" اور "تاریخ ختم نبوت" میں اول فتویٰ تکفیر کو شامل کرنے سے قاصر رہے۔ یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت حال میں یہ کیوں کر تسلیم کیا جائے کہ علماء لدھیانہ نے واقعتاً ۱۳۰۱ھ میں فتویٰ کفر دیا تھا کیوں کہ فتاوی قادریہ ان کی اپنی تحریر ہے جو کہ ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا ثبوت ایک ثانوی ماخذ سے موجود ہے جو کہ اشاعۃ السنۃ جلد نمبرے شمارہ ۶ صفحہ ۱۷۰-۱۷۱ بابت ماہ شعبان، رمضان و شوال ۱۳۰۱ھ مطابق جون، جولائی، اگست ۱۸۸۴ء کی حسب ذیل تحریر ہے:

"ناظرین ان کا یہ حال سن کر متعجّب اور اس امر کے منتظر ہوں گے کہ ایسے دلیر اور شیر بہادر کون ہیں جو سب علماء وقت کے مخالف ہو کر ایسے جلیل القدر مسلمان (یعنی مرزا قادیانی) کی تکفیر کرتے ہیں اور اپنی مہربان گورنمنٹ کے (جس کے ظل حمایت میں با امن شعار مذہبی ادا کرتے ہیں) جہاد کو جائز سمجھتے ہیں ان کے دفع تعجب اور رفع انتظار کے لیے ہم ان حضرات کے نام بھی ظاہر کردیتے ہیں وہ مولوی عبدالعزیز و مولوی محمد وغیرہ پسران مولوی عبدالقادر ہیں۔ جن سب کا ۵۷ء سے باغی و بدخواہ گورنمنٹ ہونا ہم اشاعۃ السنۃ نمبر ۱۰ جلد ۶ وغیرہ میں ظاہر و ثابت کر چکے ہیں۔"

مذکورہ تحریر سے علماے لدھیانہ کا دعوی کہ انھوں نے ۱۳۰۱ھ میں مرزا قادیانی کی تکفیر کی تھی - درست قرار پاتا ہے، گو وہ فتوی مختصر تھا اور اس فتوی کا سبب مرزا قادیانی کے کلمات کفریہ تھے نہ کہ ادعاے نبوت۔

[مولانا عمیر محمود صدیقی (کراچی) نے ایک مقالہ "مرزا قادیانی کے خلاف سب سے پہلا فتویٰ کفر کس نے دیا؟" کے عنوان سے ۲۰۱۳ء میں لکھا تھا جو کہ ماہ نامہ سوئے حجاز، لاہور میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بعد از تحقیق مقالہ نگار نے یہ موقف پیش کیا تھا کہ مرزا قادیانی کے خلاف سب سے پہلا فتوی علماء لدھیانہ نے ہی دیا تھا۔ اس کا بنیادی ماخذ بھی فتاوی قادریہ ہی تھا۔]

علماے لدھیانہ کا مسلک: علماے لدھیانہ کے مسلک کی بابت جناب ابن انیس لدھیانوی لکھتے ہیں:

"ہمارے بعض مخلص حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اکابر علماے لدھیانہ (مولوی عبدالقادر، مولوی سیف الرحمن، مولوی محمد، مولوی عبدالعزیز، مولوی عبداللہ اسی طریقہ سے دوسرے ہم عصر علماے لدھیانہ) اکابر

علمائے دیوبند کے شاگرد ہیں یا منتسبین میں سے ہیں، یہ محض غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکابر علمائے لدھیانہ نہ تو اکابر علمائے دیوبند کے شاگرد ہیں اور نہ ہی منتسبین میں سے ہیں بل کہ وہ خود ایک مکتب فکر کی حیثیت رکھتے تھے۔ براہ راست ان حضرات کو سند حدیث ولی اللّٰہی خاندان سے حاصل ہے۔ یہ حضرات تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اس وقت تک تو دارالعلوم دیوبند وجود میں ہی نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان حضرات کی آپس میں ملاقات ثابت ہے کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہی یہ حضرات تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تھے۔" (سب سے پہلے فتویٰ تکفیر:۲۷)

مزید لکھتے ہیں: "دارالعلوم دیوبند سے علمائے لدھیانہ کا انتساب یا شاگردی کا تعلق ۱۹۱۴ء کے بعد ہوا ہے جب رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے ہیں اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ساتھ علمائے لدھیانہ کا تعلق مضبوط ہوا اور ہوتا چلا گیا۔" (ایضاً)

مزید لکھتے ہیں: "یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اکابر علمائے لدھیانہ و دیوبند کا مسلک ایک ہی تھا اور ہے۔" (ایضاً)

یہاں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مولوی ابوانیس لدھیانوی کی یہ آخری بات بلادلیل ہے کیوں کہ علمائے اہل سنت و دیوبند کے مابین وجہ نزاع بننے والی متنازعہ عبارات (مثلاً تحذیر الناس، حفظ الایمان، براہین قاطعہ وغیرہ کی عبارات) کے متعلق اکابر علمائے لدھیانہ کی تائیدی رائے موجود نہیں ہے۔ نیز اکابر علمائے لدھیانہ کے دور میں سُنّی دیوبندی کی تفریق بہ حیثیت مسلک ظاہر و متداول نہ ہوئی تھی۔

علمائے لدھیانہ اور مفتی غلام دستگیر قصوری کے فتویٰ کا تقابلی جائزہ:

۱۔ مولانا قصوری نے مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کو ظاہر کیا جب کہ علماء لدھیانہ نے مرزا قادیانی کے دیگر کلمات کفریہ کے سبب تکفیر کی چناں چہ "علمائے لدھیانہ کی طرف سے فتویٰ تکفیر کی وجوہات" کے عنوان سے جناب مولوی ابن انیس لدھیانوی لکھتے ہیں:

"مرزا کا اپنے آپ کو مسیح موعود کہنا، معجزات قرآن کا انکار اور پیغمبروں کی نانیاں 'دادیاں کو فاحشہ بتلانا۔ (فتاوی قادریہ :۲۵)

فتاوی قادریہ کے مصنف مولوی محمد لدھیانوی صفحہ ۲۶ پر مختصراً وجہ تکفیر بیان فرماتے ہیں: "بعد الحمد والصلوٰۃ محمد بن مولانا مولوی عبد القادر مرحوم لدھیانوی بیچ خدمت اہل اسلام کے عرض کرتا ہے کہ غلام احمد قادیانی کی تکفیر بہ باعث کلمات کفریہ کے اول ۱۳۰۱ھ میں ہمارے ہی خاندان سے شروع ہوئی۔ اس وقت اکثر لوگ ہمارے مخالف رہے، بعد میں رفتہ رفتہ کل اہل علم نے قادیانی کے ضال مضل ہونے پر اتفاق کیا حتی کہ علماء حرمین شریفین نے بھی قادیانی پر دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ تحریر کر دیا۔ اگرچہ ان فتووں سے لوگوں کو بہت ہدایت ہوئی لیکن بعض بعض کور باطنوں کو اس آفتاب ہدایت مآب سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ یعنی جو کفریات اس کے صاف صاف آیات قطعیات کے مخالف ہیں ان پر ان کے ایمان کی بنیاد ہے جیسا کہ ازالۃ الاوہام میں عیسیٰ علیہ السلام کو یوسف نجار کا بیٹا لکھا ہے اور جو خدا تعالیٰ جل شانہٗ نے ان کے معجزات مثل حیاء اموات اور مادر زاد نابینوں کو بینا کرنا اور جانور مٹی سے بنا کر خدا کے حکم سے جاندار بنا دینا وغیرہ وغیرہ۔ جن کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے ان سب کو اس قادیانی نے مشرکانہ خیال لکھ کر منکر قرآن ہو کر اپنا کفر ظاہر کر کے زمرۂ مرتدین میں داخل ہوا۔ (فتاوی قادریہ:۲۶)

اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علماء لدھیانہ نے مرزا قادیانی کو بہ سبب اس کے کلمات و معتقدات کفریہ کے کافر قرار دیا جب کہ مفتی غلام دستگیر قصوری صاحب نے علاوہ کلمات کفریہ کے اپنی خداداد فراست سے مرزا قادیانی کے درپردہ دعویٰ نبوت کو جانا اور مرزا قادیانی کی تکفیر پر فتویٰ دیا چناں چہ مولانا قصوری لکھتے ہیں:

"اس (براہین احمدیہ) کے تیسرے چوتھے حصہ میں مصنف نے دعوی کیا ہے کہ بہت سی آیات قرآنی و عبارات عربیہ اس پر الہام ہوتی ہیں جیسا کہ صفحہ ۴۸۷ میں لکھا ہے کہ اور یہ بھی صاف دعوی کیا ہے کہ اکثر آیات فضائل انبیاء اس پر نازل ہوتی ہیں اور ان آیات سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مخاطب کیا ہے اور ان خطابات سے وہی مراد ہے اور اکثر الہامی باتیں بل کہ سب کی سب جو اس پر وحی ہوتی ہے پرلے درجہ کی اس کی تعریف ہے۔ جس سے نبیوں کے مرتبہ کو اس کا پہنچ جانا نکلتا ہے بل کہ بعض ملہمات سے اس کی انبیا سے ترقی اور تعلّی سمجھ میں آتی ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ" (رجم الشیاطین براغلوطات البراھین/خلاصہ تحقیقات دستگیر یہ رد ہفوات براہینیہ، ص:۶)

اتنا نقل کرنے کے بعد مولانا قصوری نے ہر دو قسم کے ملہمات کی مختلف مثالیں براہین احمدیہ سے نقل کی ہیں۔ پہلی قسم کے الہامات کو یہ عنوان دیا ہے "پہلی قسم کے الہامات کا نمونہ جس کو براہین احمدیہ کا مولف کامل الہام اور وحی رسالت کی مانند جانتا ہے" (ایضاً، ص:۷)

اس کے بعد مولانا قصوری نے مرزا قادیانی کی براہین احمدیہ سے ۴۷ مثالیں /الہامات پیش کیے جو کہ آیات قرآنیہ میں تحریف کرتے ہوئے مرزا نے اپنی کتاب میں اپنے حق میں الہام ہونا لکھا ہے۔ چناں چہ مولانا قصوری لکھتے ہیں:

"پس ان سنتالیس (۴۷) الہامات سے جو اکثر آیات قرآنی اور

بعض فقرات عربیہ ہیں جن کو مولف براہین احمدیہ نے اپنے لیے الہام اور وحی قرار دیا ہے یہ خوبی ظاہر ہے کہ اس شخص نے لوازم رسالت اور خواص نبوت اپنے لیے ثابت کیے ہیں کیوں کہ اول اس نے برخلاف اہل سنت اس پر یقین کیا ہے کہ اولیا کا الہام اور وحی رسالت دونوں ایک معنی رکھتے ہیں اور الہام بھی قطعی و یقینی ہوتا ہے پھر اس نے استحکام سے ثابت کیا ہے کہ جو مضامین اس پر نازل ہوتے ہیں ان کی تبلیغ واجب ہے اور وہ ڈرانے اور خوش خبری سنانے پر مامور ہے کہ جس نے خدا کا دوست بننا ہو اس کی متابعت کرے خدا اس سے محبت کرے گا اور یہ کہ اس کے ملہمات کا قبول کرنا لوگوں پر فرض ہے اور ان کا انکار منع ہے پس جو اس پر ایمان لایا وہ مومن ہے اور جس نے اس کا انکار کیا وہ کافروں سے ہے جیسا کہ چوتالیس (۴۴) اور پنتالیسویں (۴۵) الہام کے ترجمۂ اُردو میں اس نے خود تصریح کی ہے اور رسالت و نبوت کے معنی یہی ہیں کہ ایسی فضیلت عظمیٰ حاصل ہو اور نبیوں کے ساتھ شرکت کا مطلب یہی ہے کہ ایسے بڑے رُتبہ پر مشرف ہو۔ علاوہ ازیں جن خطابات سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سرورعالم اور دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والثنا کو مخاطب کیا ہے۔ صاحب براہین اب ان خطابات سے اپنے نفس کو مراد رکھتا ہے تو یہ صراحۃً الحاد فی الآیات نہیں تو اور کیا ہے!!!" (ایضاً، ص:۹۔۱۰)

اس شبہ کہ "مولف براہین خود کو علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا مورد سمجھتا ہے لہذا کیسے متصور ہو کہ وہ رسالت اور نبوت کو اپنے لیے ثابت کرتا ہے" کا جواب دیتے ہوئے مولانا قصوری لکھتے ہیں:

"تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ صریح ثابت ہے کہ مؤلف براہین نے اپنی کتب نصاری اور یہود اور بت پرستوں کے مقابلہ میں واسطے ظاہر کرنے حقیت دین اسلام کی تالیف کی ہے تو اس کتاب میں یہ درج کرنا کہ میں نبیوں کی صفتوں سے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ موصوف ہوں اور آیات قرآنی جن میں رسولوں کے خاصے مسطور ہیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں، ان کا مورد میں ہوں۔ کیا فائدہ رکھتا ہے!!! کیوں کہ جن کو قرآن پر ایمان ہی نہیں وہ ان باتوں پر کیوں کر تصدیق کریں گے اور مؤلف براہین کی عظمت شان پر ایمان لاویں گے پس معلوم ہوا کہ کہ اصلی غرض براہین والے کی ان الہامات کے بیان اور وحی کے عیاں سے مسلمانوں سے باور کرانا ہے کہ میں سب ولیوں سے افضل ہوں اور نبیوں کا نمونہ ہوں اور اس کے قادیان میں مکہ معظمہ کی طرح وحی اُترتی ہے اور اب خدا کا حکم ہے کہ سب لوگ قریب و بعید ہر طرف سے قادیان میں آویں اور ہدایت پاویں اور جو نہ حاضر ہوگا خدا تعالیٰ اُس سے حساب لے گا۔ (ایضاً، ص ۱۰۔۱۱)

مزید لکھتے ہیں: "ایسے دعوے اکابر صحابہ خصوص خلفاے راشدین و امامان اہل بیت و تابعین سے جو افضل ہیں ساری امت سے صادر نہیں ہوئے پس صاحب براہین کے یہ دعوے صریح مساوات کا اظہار ہے انبیاء و مرسلین سے اگرچہ وہ اہل اسلام کے بلوے کے خوف سے صاف اقرار نہیں کرتا کہ میں رسول ہوں لیکن یہ تو اس پر نازل ہو رہا ہے؛

قل انی امرت وانا اول المومنین، فاصدع بما تومرون اعرض عن الجاھلین، لعلك باخع نفسك ان لایکونوا مومنین، قل جاءکم نور من نور اللہ فلا تکفروا ان کنتم مومنین

جن کا ترجمہ اوپر لکھا گیا ہے پس یہ دعوی نبوت نہیں تو اور کیا ہے؟؟؟

مع ہذا اس نے اشتہار میں صراحۃً لکھا ہے کہ میں انبیا و رسل کا نمونہ ہوں جس کی نقل اوپر ہو چکی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نمونہ شے کا عین وہ شے ہوتی ہے جیسا کہ فارسی کی مثل مشہور ہے "مشتے نمونہ خروار" یعنی گیہوں کے انبار سے مثلاً ایک مٹھی اس کا نمونہ ہے تو اس اقرار اشتہار سے ثابت ہے کہ صاحب براہین اپنے آپ کو انبیا و مرسلین سے جانتا ہے۔" (ص:۱۱)

صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں: "یہ شخص باوجود دعوی اتباع آں حضرت صلی اللہ علیہ واخوانہ وسلم کے اپنے آپ کو خصائص نبوت و رسالت سے موصوف کر رہا ہے۔"

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علماے لدھیانہ نے براہین احمدیہ میں موجود کلمات کفریہ کے سبب تکفیر کی جب کہ مولانا قصوری کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ انہوں نے مرزا قادیانی کے دعوی نبوت کو جانا اور علماء پنجاب و حرمین شریفین کے سامنے پیش کر کے مرزا قادیانی کی تکفیر پر فتاوی حاصل کیے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علماء لدھیانہ کے فتویٰ تکفیر مرزا کی علماء نے مخالفت کی جس کا مفصل حال پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب کہ مولانا قصوری نے جب ۱۳۰۲ھ میں "تحقیقات دستگیریہ رد ہفوات براہینیہ" تحریر کی تو اول اس کو علماء پنجاب کے روبرو پیش کیا اور ان سے تصدیقات حاصل کیں چناں چہ ان مصدقین علماء کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا غلام رسول (امام مسجد میاں محمد جان، رئیس امرتسر) مولانا احمد بخش (مدرس مدرسۃ المسلمین، امرتسر)، مولانا نور الدین (مدرس مدرسۃ المسلمین، امرتسر)، مفتی غلام محمد بگوی (امام مسجد شاہی، لاہور) مولانا نور احمد (امام جامع مسجد انار کلی، لاہور)، مولانا نور احمد (ساکن کھائی کوٹلی ضلع جہلم)، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (مدرس مدرسہ عالیہ، لاہور)

یہاں مفتی عبداللہ ٹونکی کی تقریظ کا یہ حصہ نقل کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے چناں چہ آپ لکھتے ہیں:

"حضرت مولف (یعنی مفتی غلام دستگیر قصوری) سلمہ اللہ تعالیٰ نے مولف براہین پر مدعی نبوت ہونے کا بھی الزام لگایا ہے، میری رائے میں یہ الزام بھی صحیح اور درست ہے اس لیے کہ قطعی اور یقینی طریق سے من جانب اللہ ایسے مضامین کا منزل علیہ ہونا جن کی تبلیغ ضروری ہو- عرف شرع میں خواص رسالت یا نبوت سے ہے اور مؤلف براہین کو اس منصب کے حصول کا دعوی ہے پس اس کے مدعی نبوت ہونے میں کیا اشتباہ ہے۔" (رجم الشیاطین:۶۹)

آپ کی تقریظ کا آخری جملہ بھی قابل توجہ ہے، لکھتے ہیں: "اس لیے صریح لفظ "نبی" یا "رسول" کے اطلاق سے ہی مؤلف (براہین) نے کسی قدر احتیاط کی ہے ورنہ خواص نبوت یا رسالت کے اپنے لیے ثابت کرنے میں میری رائے میں کوئی فروگذاشت نہیں کی ہے۔" (ایضاً:۷۰)

ان اقتباسات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا قصوری کا یہ دعوی کہ مرزا قادیانی مدعی نبوت ہے -کی سب سے پہلی تائید اہل سنت کے جید عالم دین مفتی محمد عبداللہ ٹونکی نے کی۔

۱۳۰۳ھ میں مولانا قصوری نے اپنے فتوی کا خلاصۃً عربی ترجمہ کر کے علماء حرمین شریفین کو تصدیقات کے لیے بھجوایا چناں چہ درج ذیل علماء حرمین کی تصدیقات سے مزین ہو کر یہ رسالہ ۱۳۰۵ھ میں واپس آیا۔

شیخ الاسلام پایۂ حرمین شریفین مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی محمد صالح کمال (مفتی حنفیہ، مکہ معظّمہ)، مفتی محمد سعید بابصیل، مفتی محمد عثمان بن عبدالسلام (مدینہ منورہ)، مفتی سید جعفر بن سید اسمٰعیل برزنجی (مدینہ منورہ)، مفتی محمد علی بن ظاہر وتری حسینی حنفی مدنی، مفتی محمد بن عبدالقادر باشہ (پٹنہ)

۳۔ علماء لدھیانہ کا فتوی دستیاب نہیں، خود مولوی محمد لدھیانوی نے بھی اس کو فتاوی قادریہ میں شامل نہیں کیا لیکن دیگر قرائن/شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فتوی مختصر تھا پس مولانا قصوری کے فتوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے جامع و مکمل فتوی تھا۔ پس یوں کہنا نہایت مناسب ہو گا کہ اردو زبان میں مرزا قادیانی کی تکفیر میں پہلا جامع و مبسوط فتوی مولانا غلام دستگیر قصوری نے ہی دیا۔

۴۔ عربی زبان میں بھی پہلا فتوی مولانا قصوری نے ہی جاری کیا اور علماے حرمین شریفین سے تصدیقات بھی حاصل کیں۔ گو کہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری نے اپنے عربی اخبار شفاء الصدور میں مرزا قادیانی کے رد کا سلسلہ مولانا قصوری سے قبل شروع کیا۔ اس کا ثبوت ہمیں مولانا قصوری کے مصنفہ اول فتویٰ کفر یعنی تحقیقات دستگیریہ سے ہی ملتا ہے۔ مولانا قصوری لکھتے ہیں:

"مولانا فیض الحسن سہارنپوری نے اپنے عربی اخبار شفاء الصدور میں مرزا قادیانی کے عربی الہام "انت منی بمنزلۃ توحیدی و تفریدی" (براہین احمدیہ:۴۸۹) نقل کر کے لکھا ہے:

ان مولف البراہین ادعی ان منکرہ منکر التوحید۔

یعنی مؤلف براہین احمدیہ (مرزا قادیانی) نے اس الہام میں یہ دعوی کیا ہے کہ میرا منکر خدا کی توحید کا منکر ہے۔ (رجم الشیاطین: ۸)

ایک اور جگہ مولانا قصوری لکھتے ہیں:

"مولانا فیض الحسن سہارن پوری نے اپنی اخبار شفاء الصدور میں صاف لکھ دیا ہے کہ مرزا قادیانی مثل علی گڑھی نیچری کی ہے یعنی اختلال دین اسلام و اضلال خواص و عوام میں۔" (رجم الشیاطین:۱۵)

لیکن یہاں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری نے مرزا کی تکفیر بھی کی۔ اگر ایسا ہوتا تو مولانا قصوری اس کا ذکر اپنے فتوی میں ضرور کرتے جیسا کہ دیگر تردیدات کو نقل کیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عربی زبان میں مرزا قادیانی کی تکفیر میں اولین فتوی جاری کرنے کا اعزاز بلا شرکت غیرے مولانا قصوری کے سر ہے۔ نیز یہ کہ اسی فتوی کے ذریعہ علماء حرمین شریفین کو مرزا قادیانی اور اس کے معتقدات بارے معلومات حاصل ہوئیں۔

۵۔ مولانا قصوری کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مرزا قادیانی کے رد میں پہلا متفقہ فتوی جاری کیا۔ مولانا قصوری نے یہ کام ۱۸۸۵ء تک مکمل کر لیا تھا جب کہ مولوی سید نذیر حسین دہلوی کا فتوی جس کو ڈاکٹر بہاء الدین نے "اولین متفقہ فتوی" کا نام دیا ہے وہ ۹۲-۱۸۹۱ میں مرتب و شائع ہوا۔ اس سے مرزا قادیانی کی درج ذیل عبارت کا بطلان بھی ثابت ہوا:

"[مولوی سید نذیر حسین دہلوی] وہی میری نسبت سب سے پہلے فتوی دینے والے تھے جنہوں نے میرے کفر کا فتوی دیا تھا اور مولوی محمد حسین بٹالوی کے استاد تھے اور انہوں نے مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی کے استفتا پر یہ کلمات میری نسبت لکھے تھے کہ ایسا شخص ضال مضل اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" (حقیقۃ الوحی، ۲۵۸-۲۵۹)

۶۔ علماے لدھیانہ کے فتوی کا اثر لدھیانہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہا نیز اس کی شہرت اس قدر نہ ہو سکی۔ اگر یہ فتوی مشہور ہوتا تو مولانا قصوری اس کا ذکر اپنی کتاب میں ضرور کرتے جیسا کہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے اخبار شفاء الصدور سے ان کے تاثرات کو نقل کیا۔

علماے لدھیانہ کے فتوی کے برعکس مولانا قصوری کے فتوی کو علماء پنجاب و حرمین شریفین کی تصدیقات حاصل ہوئیں، یوں اس کا دائرہ اثر وسیع ہوا۔ ☆☆

آخری قسط

یورپ پر دینی درس گاہوں کے اثرات

مولانا محمد فروغ القادری

مدارس عربیہ سے متعلق ارباب حل وعقد اس امر کی نوعیت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہر عہد کے انسانوں میں ان کی ترجیحات وتقاضے بدلتے رہتے ہیں جو ایک فطری اور نفس الامری داعیہ ہے۔ قوموں کے عروج و زوال پر گہری نظر رکھنے والے افراد اس بات سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ ایک قوم کی ذہن سازی، اور اسے آفاق وانفس کی وسعتوں میں غلبے کی قوت عطا کرنے میں "تعلیم کا تصور" کس قدر غیر معمولی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں مدارس میں گذشتہ برسوں میں اگر اسی بات کی شعوری کوشش کی گئی ہوتی تو آج یہ خلا نہ ہوتا اور مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ اقطارِ عالم کے جس گوشے میں بھی پہنچتے، جدید وقدیم دونوں اصنافِ علم سے آراستہ ہوتے، اور ان کے پاس جدید ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اسلام مخالف قوتوں کی جانب سے پھیلائے گئے منفی عناصر کا بھرپور جواب ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ میری تلخ نوائی بعض اربابِ بست وکشاد کے خیالی پیکر کو مجروح کرے مگر یقین جانیے! کوئی بھی قوم انسانی تمدن کے ارتقا کو نظر انداز کر کے اپنے ترجیحات طے نہیں کر سکتی۔ آج کا انسانی تہذیب وتمدن، ترقی وارتقا کی جس منزل پر ہے دراصل وہاں اس کا شعور ہی یہ طے کرے گا کہ اسے بقاے باہمی کے لیے کس نسخۂ کیمیا کی ضرورت ہے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی کی فقہی بصیرت اور ان کے تبحرِ علمی کو اس وقت تک خراج عقیدت پیش نہیں کی جاسکتا، جب تک ان کے علمی کارناموں اور اصلاحی کوششوں کو اس عہد کے تناظر میں نہ دیکھا جائے۔ حضرت سیدنا مجدد الف ثانی اور علامہ فضل حق خیر آبادی جیسے اکابرین امت کے اصل کارناموں کو اسی وقت سمجھا جائے گا۔ جب ہمارے سامنے وہ تمام چیلنجز ہوں گے جن سے اس دور کے مسلمان نبرد آزما تھے۔ آج دنیا سائنس کے عہد سے نکل کر ٹیکنالوجی کے دور میں نہ صرف داخل ہو چکی ہے بلکہ حیرت انگیز پیش قدمی کر چکی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی دنیا میں انقلاب نے قوموں کے درمیان موجودہ فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ تیر وتفنگ کا دور تو گزر چکا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب ایٹم بم بھی قصۂ پارینہ ہے۔ مادی ترقی کی وہ تمام منزلیں سر کر لی گئی ہیں جو خود بھی ائمۂ مادیت کے وہم و گمان میں نہ تھیں۔ حتیٰ کہ اس زمین سے اختتامِ تاریخ (End of History) کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں اور لوگ سنجیدگی سے یہ سوچنے لگے ہیں کہ کیا مادّی ترقی کے ناگزیر نتیجے کے طور پر وہ ناآسودگی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے جس نے انسان کے روحانی وجود کو نظر انداز کرنے کے باعث جنم لیا ہے۔ چناں چہ ترقی یافتہ ممالک میں وہ بحثیں پھر زندہ ہونے لگی ہیں کہ اصلاً مذہب کی دلچسپی کا میدان کیا ہے، اس اعتبار سے دنیا ایک بار پھر نظری دور میں داخل ہو گئی ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں جن موضوعات پر سب سے زیادہ کانفرنسیں، سیمینار، مذاکرے اور Debates منعقد ہو رہے ہیں اور فورم وجود میں آرہے ہیں، وہ مذہب کے عملی کردار، تعاون بین المذاہب، احیاے مذہب، انسانی اقدار، مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور تہذیبوں کے اختلاط وتصادم سے متعلق ہیں۔ گویا معاملہ وہی ہے جس کی نشان دہی شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے بہت پہلے فرمائی تھی۔

دنیا کو ہے اس مبدأ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

بقاے اصلح (Survival of the Fttest) کے اصول کے تحت وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو اس نظری اور عملی معرکے کو سر کرے گی۔ لیکن اس معرکہ آرائی میں آپ اسی وقت بطور فریق حصہ لے سکتے ہیں جب آپ مادّی ترقی کے اعتبار سے دنیا کے مد مقابل کھڑے ہونے کے اہل ہوں گے۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن اور فکر و فن کے موجودہ ارتقائی مرحلے کو نظر انداز کر کے اور اٹھارہویں یا انیسویں صدی میں رہتے ہوئے اس اہم معرکے کو سر کیا جاسکتا ہے تو ہم مجبور ہیں کہ اس کی دماغی صحت پر شبہہ کریں۔ ہمارے ہاں علم وفلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج، شعر وادب کی محفلوں کے بزم طراز، تشنگانِ معارف وحقائق اور علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشینوں کی ہرگز کمی نہیں، مگر پھر بھی کیا وجہ ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ اور حرکتِ فلک کی معنیٰ خیزیوں سے بے خبر ہیں۔ بعض نظریاتی اور فروعی اختلافات کے ضمن میں ہمارے ارباب علم ودانش کی مجتہدانہ تحریریں اخبار ورسائل میں اکثر وبیش تر دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر جدید فکری حقائق کے ادراک اور عالمی طرزِ عمل کی تبدیلی (New World Order) اور استعماریت کا اسلامی تعلیمات کے خلاف میڈیا تحریک کے حوالے سے یہ حضرات دقت نظر صرف کیوں نہیں کرتے۔

یقین جانیے! مجھے عربی درس گاہوں کے تقدس اور اس کے روایتی اقدار اور تعلیمی نظم و ضبط میں ایک لمحے بھر کے لیے شک و شبہہ نہیں، اقطارِ عالم کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے علما و فاضلین اسی زمین سے اٹھے ہیں۔ تاہم فکری و عقلی ارتقا کی جد و جہد آج سے پہلے اس قدر برق رفتار نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ اسلام کا آفاقی تصور اور غلبۂ دین کی حکمت عملی اس بات کا متقاضی ہے کہ یورپی دانش گاہوں کے مد مقابل جدید لب و لہجے سے آراستہ مبلغین کی جماعت علم و فن کی جولانگاہ میں اتاری جائے اور اس عمل کے بغیر موجودہ ہیئت اجتماعی کو بدلنا دشوار گزار ہوگا۔ مذہب و ملت کی بقاے دوام کے لیے ہمارے قائدین میں اپنے عہد کا حقیقی شعور حد درجہ ضروری ہے۔ فاتح اور غالب قوموں کی تاریخ حیات میں ان کیفیات و عناصر کا اندازہ آپ یقیناً کریں گے۔ یہ تصور محض ایک ردِّ عمل کا ظہور نہیں بلکہ یہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہے۔

مذہبیت اور لامذہبیت کی کشمکش ہر دور میں رہی ہے۔ اس وقت یہاں یورپ و امریکہ میں اسلام سب سے زیادہ موضوعِ سخن ہے۔ مستشرقین یورپ اسلام کی ایک نئی تعریف و توضیح Defination تیار کرنے میں لگے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ایک نظام اختراع کیا جائے جو اپنی فطرت اور ماہیت کے حوالے سے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور Modrate ہو۔ جو حد درجہ معتدل اور قوتِ برداشت رکھنے والا ہو۔ جو Mutual Understanding کے ساتھ اقوامِ عالم کو ساتھ ساتھ لے کر چلے اور پھر وہ ہر طرح کے مزاحمتی اقدامات سے خالی ہو۔" حالاں کہ مغرب میں اسلام کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والے اربابِ حل و عقد یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی لے کر آیا ہے۔ "Islam has a complete way of life" وہ Democratic role of state اور Voice of democrate کو حکومتی نظامِ عمل اور انفرادی زندگی میں حد درجہ ترجیح دیتا ہے۔ قرونِ اولیٰ کے دورِ اقتدار میں آزادیِ آرا اور Independence of Thinking کے باب میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

متمدن دنیا کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام نے نسلِ انسانی کو سب سے زیادہ تحفظ فراہم کیا ہے۔ صناعی قدرت کے اس خوب صورت شاہ کار کو ہر لمحہ اس کی لازوال مقصدیت سے آگاہ رکھتا ہے۔ اسلام میں شخصیات کی عزت و تکریم کا مدار ان کی خصوصیات اور Merits کی بنیاد پر ہے۔ دنیاوی معاملات کے حصول میں ایک مومن کو باضابطہ تاکید کی گئی ہے کہ اس میں Tolerence (برداشت) کا مادّہ موجود ہو تاکہ وہ Difference of opinions کو برداشت کر سکے۔ اس کے اندر Ballanced Attitude ہو۔ میں یہاں جب انگریزی اخبارات و رسائل اور میڈیا کی وساطت سے دیکھتا اور پڑھتا ہوں تو مجھے مغربی دانش وروں پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ یہ اسلام کی اس عظیم صداقت کو براہِ راست چیلنج کر رہے ہیں جس نے مغرب کے بادیہ نشینوں کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں سے آشنا کیا۔ آج ہندوستان سے لے کر امریکہ تک مسلم دشمن قوتیں منظم ہیں۔ پورا عالمِ کفر عالمِ اسلام سے برسرِ پیکار ہے۔ تاہم حالات کے تناظر میں مسلم دنیا کے پاس ایسی کوئی تحریک نہیں جو اپنے مثبت لائحۂ عمل کی بنیاد پر مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی قیادت کر سکے۔ خاص کر بر صغیر ہند و پاک میں اہل سنت کے علما اور عوام کا جو حال ہے وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ تمام تر قلمی اور علمی صلاحیتیں غیر ضروری مباحث کے دفاع میں لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنے نزاعی مصارفِ عمل سے فرصت ہی کہاں کہ ہم بیرونی حالات کا جائزہ لے سکیں۔

ادھر مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کی لازمی شمولیت اور اس کی افادیت پر اربابِ حل و عقد کی خصوصی توجہ حد درجہ ضروری ہے۔ بعض علمی حلقوں سے بھی حالیہ دنوں میں اس کی صدائے بازگشت بڑے شد و مد سے سننے میں آرہی ہے۔ اور یقینی طور پر یہ ایک سنجیدہ کوشش اور اپنے وسیع تر مفاد میں دانش مندانہ جذبۂ عمل ہے۔ تادمِ تحریر مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس طرح کی ارتقائی تبدیلی اس معاشرے میں اور بھی دشوار گزار ہے جہاں علماے اہل سنت کا مختلف گروہ غیر اہم بنیادوں پر باہم متحارب ہو۔ بلا شبہہ جماعتی پس منظر میں ہمارے ہاں نظریاتی و فکری اختلافات کی روایت عام رہی ہے۔ تاہم کسی بھی لمحے میں احترامِ انسانیت اور مذہبی بقاے باہمی کے نقطے پر دانشورانہ طبقہ متاثر نہ ہو سکا۔

جیسا کہ میں ماقبل کے سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ "موجودہ درس نظامی" اور اس کی جامعیت میں قطعی کوئی کلام نہیں، تاہم عصری مقتضیات کے پیش نظر مدارسِ عربیہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی لٹریچر کا اضافہ حد درجہ ناگزیر اور لازمی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے طلبہ عالمی و آفاقی سطح پر اسلامی تعلیمات و نظریات کو موثر ترین انداز میں پیش کر سکیں گے، جس کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ آج دنیا ایک Global Village بن چکی ہے اور اس میں Vast Global Interaction ہو گیا ہے۔ ہمارے میڈیا Print & Electronic

Communication نے پوری دنیا کو سمیٹ لیا ہے۔

The whole world is now confining it self in a small village to get acces to every kind of happening is impossible without english language.

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج عالمی رابطہ اور ذرائع ابلاغ کی زبان انگریزی ہے۔عصر جدید کے طلبہ کو اس سے محروم رکھنا کسی علمی معصیت اور فکری خیانت سے ہرگز کم نہیں۔بعض قدیم اور روایت پسندانہ طریقۂ تدریس کے حامل مدرسین کو میں نے اکثر یہ کہتے سنا کہ انگریزی پڑھ کر علما حصولِ دنیا کی طرف زیادہ توجہ دیں گے۔حالاں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ہم ہند و پاک میں رہ کر اس کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔بیرون ملک جس قدر اسلامی درس گاہیں اور دینی مراکز دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں وہ اسی زبان میں دے رہے ہیں۔مبلغِ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی علیہ الرحمہ نے امریکہ، افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک میں اسلامی فتوحات اسی زبان کی بنیاد پر حاصل کی تھیں اور امت کے حساس، بیدار مغز اور مستقبل شناس علما و طلبہ کے لیے یہ مواقع آج بھی موجود ہیں۔میں مدارس عربیہ کے اربابِ حل و عقد سے مودبانہ گذارش کروں گا کہ وہ انگریزی زبان و ادب کو باضابطہ درس نظامی میں شامل کریں۔ESP یعنی English for Specific Purpose کا Objective بھی شامل کیا جائے۔اسی طرح انگریزی لازمی مضمون کی حیثیت سے داخلِ نصاب ہو،اس میں اسلامی تہذیب اور ثقافتی موضوعات کو بھی شاملِ درس کیا جا سکتا ہے۔اس سے نہ صرف انگریزی میں اسلامی تعلیم و ثقافت کو فروغ ملے گا،بلکہ انگریزی کی تدریسی زبان اور اس کے لب و لہجہ کو مزید تحریک میسر ہو سکے گی۔اور اس سے مغربی ممالک میں واقع اسلامی اشاعتی اداروں کی معاونت سے انھیں ایک موزوں اسلامی ثقافتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے جو بدقسمتی سے اب تک نہ ہو سکا۔

واضح رہے کہ ان دنوں مغرب میں صوفیانہ لٹریچر کے مطالعے کی جانب عام لوگوں کا رجحان کافی حد تک بڑھ رہا ہے، جیسا کہ Mr. Jane Lampman کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔وہ لکھتا ہے کہ:

The best selling poet in the USA as none other than the famous sufi Jalaluddin Rumi (R.A.)

مدارسِ عربیہ میں انگریزی پڑھانے کا ایک اہم مقصد مغربی دنیا تک اسلامی تہذیب و ثقافت کی براہِ راست ترسیل بھی ہے تاکہ اس کی وساطت سے ہم اہلِ مغرب میں اسلام کے حوالے سے پائی جانے والی بد گمانی کا کسی حد تک ازالہ کر سکیں۔گذشتہ دو دہائیوں سے مغربی ذرائع ابلاغ نے اسلام کے خلاف موثر پروپیگنڈہ کا آغاز کر رکھا ہے۔ایک مکمل منصوبے کے تحت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اسلامی نظامِ حیات اور اس کے تعلیمی اصول و نظریات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔مغرب کے پالیسی ساز ادارے اسلامی تعلیمات کی حفاظت کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلم معاشرے کی خشک کھیتیوں کو سیراب کرنے والے چشمۂ سیال انھیں مدرسوں سے پھوٹتے ہیں۔اسلامی تحریکات کو ایک نیا جوش و ولولہ یہیں سے فراہم ہوتا ہے۔پیغمبرِ اعظم کی عظمت پر نقد جاں حاضر کرنے والے سرفروش یہیں سے اٹھتے ہیں۔اس لیے اسلامی مدارس کی ہزار ہا سال پر مشتمل روایت پسندانہ اور مضبوط ساکھ کو مجروح کرنے کے لیے مدارس کے نصاب و نظام کی بعض کمزوریوں اور بعض غیر معیاری مدارس کے تشدد پسندانہ رویوں کا پروپیگنڈہ کر کے رائے عامہ میں ان تمام مدارس کے خلاف نفرت پھیلانے کا منصوبہ تشکیل دیا گیا ہے۔انٹرنیٹ پر آئے دن اسلام مخالف مواد کی تشہیر ہو رہی ہے جہاں مغربی اربابِ علم و دانش کی ایک مکمل ٹیم اسی حوالے سے سرگرمِ عمل ہے۔ان حالات میں مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل علما پر اس طرح کی عالم گیر مذہبی ذمے داری کس حد تک بڑھ جاتی ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ عصر حاضر میں بین الاقوامی سطح پر اسلام مخالف عناصر اور مستشرقین یورپ کی زبان انگریزی ہے۔ہمیں اپنی بقاے باہمی اور ملت کے اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لیے انگریزی پڑھنا ہوگا۔

اس مضمون کے اختتام پر شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کی نظر میں مدارسِ اسلامیہ کی قدر شناسی ملاحظہ فرمائیں۔

”ان مکاتب کو اسی حال میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔“ ○

اسلامی ثقافت کی ترویج واشاعت میں مدارس کا کردار

محمد عابد چشتی ثقافی

اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کو جس کا شمار دنیا کی پانچ بڑی تہذیبوں میں سر فہرست ہوتا ہے مسلم معاشرہ کی پہچان کے سب سے معتبر حوالہ کے طور پر جانا جاتا ہے، جس نے اپنے دور عروج میں دنیا کو امن، شائستگی اور انسانیت کے صحیح مفہوم سے آگاہ کیا۔ مگر آج اس ثقافت کی علمبردار مسلم قوم عملی طور پر خود اپنے ہی ثقافتی آثار سے بالکل ناآشنا اور بے خبر ہوتی جارہی ہے اور اس کے برعکس اس کے کردار وگفتار کی ہر ادا اسلامی ثقافت کے بجائے مغربی تہذیب کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اور آج جبکہ اسلامی ثقافت کے زوال کی آخری کڑیاں جوڑی جارہی ہیں مسلمانوں کی شناخت کرنا بھی مشکل پڑگئی ہے۔ ایسے پر فتن اور تہذیبی بکھراؤ کے دور میں مسلم معاشرہ میں اسلامی ثقافت کے جو تھوڑے بہت آثار کہیں کہیں اور کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں اس کے متعلق منصفانہ تجزیہ یہی ہے کہ ان کے پیچھے مدارس اسلامیہ کی مسلسل جدو جہد اور پیہم کوششیں اپنا کام کر رہی ہیں جو اپنی پوری قوّت صرف کرکے امت مسلمہ کے ناطے کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب سے جوڑے ہوئے ہیں اور تمام ممکنہ وسائل کے ذریعہ اسلامی ثقافت کے حوالے سے امت مسلمہ کے فکری احیا کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اسلامی ثقافت کا تحفظ اور مدارس:

کسی بھی تہذیب اور ثقافت کی ترویج اور سماج میں اس کی اشاعت کے لیے سب سے پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے خود کو اس تہذیب میں ڈھالا جائے، اس لیے کہ سماج میں ثقافتوں کے تبادلے کا عمل رول ماڈل کے طور پر ایک فرد کے ذاتی تحفظ سے شروع ہوکر آگے بڑھتا ہے۔ یعنی کسی بھی تہذیب کو رواج دینے کے لیے اس کے محسوس مظاہر کا ہونا ضروری ہے صرف کتابیں لکھ کر اور تحریرات کے انبار لگاکر کسی تہذیب کی چاہے جتنی اہمیت اور افادیت کو بتایا جائے بغیر کسی رول ماڈل کے یہ ساری چیزیں غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ الحمدللہ آج اسلامی مدارس اسلامی ثقافت کی ترویج کے سلسلہ میں اسی نظریہ پر عمل پیرا ہیں، چنانچہ اسلامی مدارس کے طلبہ، اساتذہ اور دیگر افراد نے سب سے پہلے اپنی زندگی کو اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھالا اور دنیا میں زندگی کے ہر شعبہ میں ہزاروں تبدیلیاں اور فیشن کے نام پر دل کو لبھانے والے سینکڑوں ذرائع کی ریل پیل ہونے کے باوجود یہ افراد سب سے بے نیاز ہوکر اپنی ہر خواہش کا رخ اسلامی ثقافت کی طرف موڑے ہوئے ہیں۔ اور زمانہ چاہے جس طرف جائے یہ مدارس اسلامی ثقافت کو اپنی زندگی کا قبلہ بناکر بس اسی سمت جھکے ہوئے ہیں۔ کہنے کو تو یہ اسلامی ثقافت کا تحفظ ہے مگر درحقیقت یہ اسلامی ثقافت کا بالکل خاموش اشاعتی عمل ہے جو دھیرے دھیرے مسلم سماج میں اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اور کر رہا ہے۔

نظافت و پاکیزگی، رواداری، ہمدردی، حسن معاشرت، لباس میں شائستگی، زبان میں چاشنی اور نرمی، چہرے پر داڑھی، سر پر ٹوپی، فحش عادات سے دوری، غیر ضروری باتوں سے اجتناب، چال ڈھال میں تواضع و انکساری کی جھلک، کھانے پینے کے آداب، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، جذبہ خیر سگالی، اچھائی کا حکم برائیوں سے روکنا، قرآن کی تلاوت، نمازوں کی پابندی غرض ہر وہ علامت اور کام جو اسلامی ثقافت کے دائرے میں آتے ہیں ان سب کو آج بھی اسلامی مدارس تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ چونکہ اسلامی ثقافت کا دائرہ چند مذہبی رسم ورواج یا مخصوص معاملات تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلامی ثقافت امت مسلمہ کی زندگی کے ہر لمحے اور اس میں آنے والے ہر نشیب و فراز کا احاطہ کرتی ہے اسی لیے مذکورہ تمام شعبوں سے اسلامی ثقافت مربوط ہے۔ اور یہ ساری چیزیں اپنے اسلامی تشخص کے ساتھ مدارس میں محفوظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی صحیح تہذیب اور اس تہذیب کے صحیح خدوخال دیکھنے کے لیے آج بھی مدارس کا رخ کیا جاتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے اشاعتی ذرائع اور مدارس:

مسلم معاشرہ کا اسلامی معاشرہ سے ناطہ جوڑنے اور اسلامی تہذیب کو سماج میں متعارف کرنے کے جتنے ممکنہ ذرائع ہوسکتے ہیں وہ سب اسلامی مدارس فراہم کر رہے ہیں مثلاً۔ اسلامی تعلیم کا فروغ، علمائے کرام، واعظین، مبلغین، ائمہ کرام، مصنفین اور روحانی قائدین یہ وہ ذرائع ہیں جو مختلف میدانوں میں اسلامی ثقافت کی ترویج میں اپنا

اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور مدارس سے نکل کر سماج کی پراگندہ اور تعفن زدہ فضا میں اسلامی ثقافت کی خوشبو بکھیرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ قدرے تفصیل درج ذیل ہے:

اسلامی تعلیم: یہ بات بہرحال مان لینے والی ہے کہ اسلامی ثقافت کے فروغ اور ارتقا کے لیے اسلامی تعلیم اور علوم اسلامیہ کا فروغ ناگزیر ہے۔ اور یہ کام مدارس اور ارباب مدارس اپنی اپنی سطح اور موجودہ امکانات کے مطابق بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اگر آج ہندوستان اور دیگر ممالک میں مدارس اسلامیہ کا اتنا بڑا جال نہ بچھا ہوتا تو اسلامی تعلیم بہت حد تک اپنا وجود کھو دیتی اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسلامی ثقافت کی بقا اور تحفظ پر بھی سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا۔ مگر یہ اسلامی مدارس اور ان سے جڑے مخلص افراد کی جواں ہمتی ہے کہ انہوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کا تسلسل جاری رکھنے کی ذمہ داری اپنے ناتواں کاندھوں پر قبول کی اور اس کے لیے ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون سے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے رضاکارانہ امداد و تعاون سے دینی مدارس میں اسلامی تعلیم کے آزاد نظام کی بنیاد رکھی۔ بعد میں یہی تعلیمی نظام اسلامی ثقافت کے تحفظ کا پیش خیمہ ثابت ہوا جس کا اعتراف اور احساس اپنے اور غیر سبھی کو ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی مدارس مسلسل ایسے رجال تیار کر رہے ہیں جو مسلم سماج اور اسلامی ثقافت کے درمیان رابطے کا کام کر رہے ہیں۔ واعظین اپنے وعظ و نصیحت مبلغین اپنی تبلیغ، مصنفین اپنی نگارشات، ائمہ کرام اپنی مساجد اور روحانی قائدین اپنے ارشادات اور خانقاہوں کے ذریعہ اپنے اپنے حلقہ اور اثر کے اعتبار سے ایمانی جذبات کے احیا اور اسلامی ثقافت کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب وہی افراد ہیں جن کی شخصیت کو مدارس نے اپنی خستہ حال چٹائیوں پر دال روٹی کھلا کھلا کر پروان چڑھایا ہے جو انتہائی بگڑے ہوئے سماج سے لائے گئے تھے مگر مدارس کے علمی فیضان نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ آج یہی افراد اسلامی تہذیب کی نمائندگی اور اس کی اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ جس کا سارا کریڈٹ اسلامی مدارس ہی کو جاتا ہے۔

اسلامی ثقافت کو مٹانے کی کوشش اور مدارس:

جس صدی میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں یہ ثقافتی یلغار اور تہذیبی تصادم کی صدی ہے، جہاں دنیا کی بڑی طاقتیں نت نئے ہتھکنڈوں کے ذریعہ دنیا کی ہر علاقائی، ملکی اور مذہبی تہذیبوں کو ختم کر کے پوری دنیا کو اپنی تہذیب اور ثقافت کے چولے میں دیکھنا چاہتی ہیں اور عالمی سطح پر یہ باور کرانے میں لگی ہوئی ہیں کہ قدیم زمانے کی رائج یہ تہذیبیں اب وقت کی چاپ سے چاپ ملا کر چلنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب بات اسلامی تہذیب و ثقافت کی آتی ہے تو پھر ان طاقتوں کا ردعمل اور شدت اختیار کر جاتا ہے اس لیے کہ انہیں بخوبی اس بات کا علم ہے کہ اسلامی ثقافت اور تہذیب دنیا کی وہ واحد تہذیب ہے جو توحید و رسالت کی ان مقدس بنیادوں پر استوار ہے جن کا متزلزل کرنا بہت دشوار ہے اور یہی وہ تہذیب ہے جو دنیا کے بدلتے ہوئے ہر منظر نامہ پر اپنا اعتراف خود کروالیتی ہے۔ اسی لے آج عالمی سطح پر جس تہذیب کو مٹانے کی مہم ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر چلائی جا رہی ہے وہ اسلامی تہذیب اور ثقافت ہے اور ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اسلام مخالف طاقتیں اپنے اس مقصد میں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور کامیاب بھی ہو رہیں ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ان اسلامی مدرسوں کا جن کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اسلام مخالف عناصر کے تہذیبی حملوں کا آخری فصیل بن کر مقابلہ کر رہی ہیں اور انہیں مدرسوں سے اسلامی تہذیب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہزار بے سروسامانی کے باوجود مسلسل تیل فراہم کیا جا رہا ہے ورنہ اسلامی ثقافت کا یہ چراغ "گلوبلائزیشن" نام کی مغربی آندھیوں سے کب کا گل ہو چکا ہوتا۔

چونکہ اسلامی ثقافت کے تحفظ کا دار و مدار بہت حد تک اسلامی مدارس اور ان کے نظام تعلیم پر ہے جس کا احساس اسلام مخالفوں کو بھی اچھی طرح ہے، اس لیے اب ان کی کوشش یہ ہو رہی ہی ہے کہ یا تو سرے سے اسلامی مدارس کو مشکوک ٹھہرا کر ان کو بند کرنے کا سامان مہیا کر دیا جائے اور اگر اس میں کامیابی نہ مل سکے تو کم از کم مدارس کے اندر رائج تعلیمی نظام میں پر فریب مشوروں کے ذریعے ایسی تبدیلیاں کر دی جائیں کہ مدارس کا ڈھانچہ تو برقرار رہے مگر وہ اپنی تاسیسی معنویت کھو دیں۔ اور یہ دونوں چیزیں اسلامی ثقافت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ہیں۔ مدارس پر دہشت گردی کا الزام یا اس کے تعلیمی نظام کو فرسودہ قرار دینا اسی سازش اور فکر کا شاخسانہ ہے تاکہ مدارس کو کسی طرح نقصان پہنچے جس کی چوٹ بالواسطہ اسلامی ثقافت پر پڑے گی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مومنانہ فراست کے حامل علما جگہ جگہ مدارس و مکاتب کی بنیاد رکھ کر اور اس کے نظام تعلیم میں غیر ضروری تبدیلیاں نہ کر کے اسلامی ثقافت کے سوتوں کو خشک کرنے کی ان ناپاک کوششوں پر عملی قدغن لگا رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا آپ کا اور ہر فرد مسلم کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ مدارس کے تحفظ اور اس کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کریں۔

تحریک آزادی میں علماے اہل سنت کا کردار

محمد ابرار علی مصباحی

تحریکِ آزادی میں علماے اہلِ سنت کا کردار بلا شبہہ قابلِ تقلید رہا،انہیں حضرات کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج ہندوستان کی کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ہندوستان کی جنگ آزادی کی ابتدا ۱۷۵۷ء سے ہوئی جو ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن پر اختتام کو پہنچی،ایک سو توّے سالہ جنگ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،اس کا پہلا دور ۱۷۵۷ء شروع ہوکر ۱۸۵۷ء پر ختم ہوا،اور دوسرا دور جو در اصل تحریکِ آزادی کے نام سے معنون ہونا چاہیئے،۱۸۸۵ء سے شروع ہوکر ۱۵،اگست ۱۹۴۷ء میں آزادیِ ہند پر اختتام پذیر ہوا،پہلے دور میں باضابطہ میدانِ جنگ میں معرکہ آرائیاں ہوئیں،بے شمار لوگوں نے انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کیا،لیکن غدارانِ وطن کی اعانت سے سات سمندر پار سے آنے والی سیاہ فام قوم یکے بعد دیگرے ہر میدان میں کامیاب ہوتی چلی گئی،انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں لڑی گئی،دوسری جنگ ۱۷۶۴ء بکسر (بہار) میں وقوع پذیر ہوئی،تیسری جنگ علاقہ روہیل کھنڈ ۱۷۷۴ء میں لڑی گئی ،چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹنم (جنوبی ہند) میں ہوئی،اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں بندیل کھنڈ اور دلی کو اپنی شاطرانہ چالوں سے معاہدوں کے جالی میں پھنس کر عملی طور پر پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کرلی،اور حقیقتاً برائے نام نواب اور راجہ باقی رہ گئے،لیکن اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا،یہاں تک کے دلی کا حکمران بھی انگریزوں کا تنخواں دار اور محکوم وفرماں بردار بنادیا گیا،یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کا ملک گیر انقلاب،تصادم اور ہنگامہ ہوا،جس میں مسلمانوں کی قوت فنا ہوگئی ، انگریزوں کی چیرہ دستیاں بڑھ گئیں،انگریز پورے ملک پر قبضہ کرنے کے بعد دلی کے تخت و تاج کے مالک بن گئے،پھر ۱۸۵۷ء تک برّ صغیر ہند وپاک اور بنگلہ دیش کا مسلمان دیوبندیا اور بریلوی مسلک میں تقسیم نہیں ہوا تھا،نہ دیوبندی اور بریلوی نام سے کوئی جماعت عالمِ وجود میں آئی تھی،یہ مسلکی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی کے بعد پیدا ہوئی،

۱۸۵۷ء کی جنگ مسلمان ہار گیا،اور اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں رکھی گئی جو بعد میں دارالعلوم دیوبند بن گیا،اور یہاں کے فضلا اپنے کو دیوبندی کہنے اور لکھنے لگے،اس تاریخی حقیقت کے بعد اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی علماے دیوبند نے لڑی ہے تو اس دعویٰ کو جھوٹ غلط بیانی اور تاریخ کے چہرے پر سیاہی پوتنے کے سوا کوئی دوسرا نام دیا جاسکتا تھا،آج کل کچھ خود ساختہ مورخ اور مصنف یہ ذلیل حرکت کر رہے ہیں کہ در اصل جنگِ آزادی علماے دیوبند نے لڑی ہے ۔بدیہی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ۹،نو سال بعد مدرسہ دیوبند کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو یہ جنگِ آزادی علماے دیوبند نے کیسے لڑی؟ یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں علماے کرام نے قائدانہ رول ادا کیا،جس کی وجہ سے بڑی تعداد کو انگریزوں نے جوشِ انتقام میں عبور دریاے شور (کالا پانی) تختۂ دار پر چڑھانے کی سزا سے لے کر یہ وحشیانہ سزا بھی دی کہ ان میں سے بعض کو زندہ سوّر کی کھال میں سِل کر کھولتے ہوئے گرم تیل میں ڈال دیا،ایسی انسانیت سوز حرکت دنیا میں کسی قوم کے ساتھ نہیں کی ہے،انگریزوں کے اقتدار میں آنے کی یہ وہ سیاہ تاریخ ہے جو ہمیشہ کے لیے انگریز قوم کو داغ دار کر گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء اور اس سے پہلے جن علما نے حرّیت کا صور پھونکا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا،ان کا تعلق کس جماعت سے تھا؟اور وہ دیوبندی تھے؟بریلوی تھے؟ یا کسی اور جماعت سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ وضاحت پہلے کی جاچکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے خاتمے کے نو(۹) سال بعد مدرسہ دیوبند عالمِ وجود میں آیا،اس لیے انہیں دیوبندی تو کہا ہی نہیں جاسکتا اور بریلوی کا لفظ بھی بہت بعد میں عوام وخواص میں ایک جماعت کی حیثیت سے متعارف ہوا،اس لیے یہ

بھی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ بریلوی جماعت نے جنگِ آزادی لڑی البتہ یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ وہ عظیم الشان رفیع المرتبت علمائے کرام جنہوں نے جنگِ آزادی میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ لہلہائے حریت کے لیے قربان کردیا، وہ جماعت اہلِ سنت سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں کے پس رو، ہم مسلک، ہم عقیدہ، ہم خیال بریلوی جماعت کے علمائے کرام ہیں ۔اس لیے یہ دعویٰ قطعاً غلط نہ ہوگا کہ موجودہ بریلوی جماعت کے اسلاف نے ہی جنگِ آزادی لڑی ہے اور انہوں نے ہی اس لڑائی میں خندہ پیشانی کے ساتھ تختۂ دار کو قبول کیا ہے، اس لیے آج جماعتی تقسیم کے بعد یہ دعویٰ بالکل حق ہے کہ جنگِ آزادی علمائے اہلِ سنت نے ہی لڑی ہے۔

تحریکِ آزادی انقلاب ۱۸۵۷ء کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علمائے اہلِ سنت نے اس جنگ کو جہاد کا نام دیا تھا، علامہ فضلِ حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ مدارسی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا لیاقت علی الہ بادی مفتی عنایت احمد کاکوری، سید مبارک شاہ رام پوری، مولانا رضا علی بریلوی وغیرہم سینکڑوں علماء نے فتویٔ جہاد کی اپنے اپنے علاقوں میں خوب تشہیر کی اور ملک بھر میں ایثار وقربانی کی عام لہر پیدا کردی، یہ اسی فتویٔ جہاد کا اثر تھا کہ ہزاروں علماء نے اس جنگ میں حصہ لیا، اور جیل کی سلاخوں سے لیکر پھانسی کے پھندوں تک سفر بہ آں عزم وحوصلہ مسکراتے ہوئے طے کیا،

جن علمائے کرام کے اسما راقم الحروف نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے وہ سب کے سب حنفی سنّی یعنی علمائے اہلِ سنت وجماعت سے تھے جن کو آج بھی علمائے اہلِ سنت اورسنی عوام سلام پیش کر رہے ہیں اور کل صبحِ قیامت تک پیش کرتے رہیں گے،

اس حقیر کے ناقص مطالعہ میں علامہ یٰسین اختر مصباحی کی وہ تحریر بار بار یاد آرہی ہے کہ انہوں نے ایک مضمون میں لکھا کہ جب بھی تحریکِ آزادی کا مسئلہ ہمارے سامنے پیش آتا ہے تو میں یہ برملا کہتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہی در حقیقت حقیقی جنگِ آزادی ہے، جس میں علمائے اہلِ سنت پیش پیش رہے، انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب کیا تھے، یہ ایک اہم بحث ہے جسے بار بار اٹھایا جاتا ہے ہم انتہائی اختصار کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں،

ہندوستانی زمینوں کا اصل فائدہ انگریز حاصل کررہے تھے۔ ہندوستانی تجارت وصنعت کو انہوں نے اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا تھا اور اس کا بیش فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا تھا، یہ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہندوستانی عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی یا انہیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ہندوستانی ہونے کے باوجود ان کا دل ودماغ انگریز جیسا ہوجائے، ہندو مسلم کی منافرت پھیلائی جارہی تھی، اور سماجی رسم وروایات کے تاروپود بکھیرے جارہے تھے، پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعہ دینِ مذہب پر حملے کیے جارہے تھے، بلکہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جارہی تھی، علماء ومشائخ کی توہین کی جارہی تھی، ان سب میں مذہب سب سے اہم تھا، عام طور پر مسلمانوں کو اور دیگر ہم وطنوں میں یہ خوف پنپ رہا تھا کہ ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنادیا جائیگا، ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تھا، اس لیے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں میں غم وغصہ بھی زیادہ تھا اور انگریزوں کے خلاف مسلم عوام اور علمائے کرام پیش پیش بھی تھے۔

۱۸۵۷ء کی عام ناراضی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے عدالتِ عالیہ مدارس ممبر کونسل سر میلکم لوئن نے لندن کے ایک رسالے میں لکھا تھا کہ

''ہم نے ہندوستانی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، امرا کی ریاستیں ضبط کیں، تکلیف دے کر مال گزاری وصول کی، اونچے خاندانوں کو برباد کرکے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست کیے، (روشن مستقبل ص ۱۱۰،۱۰۹)

انگریزوں کی ایک انتہائی بھیانک سازش یہ تھی کہ وہ نئی نسلوں کے فکری ارتداد کے لیے مسلسل جدوجہد کررہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ خاکِ ہند کے ساتھ باشندگانِ ہند کے دل ودماغ پر بھی ہمارا قبضہ ہو، بلکہ وہ انہیں عیسائی بنانا چاہتے تھے، اپنے اس مقصد کے لیے انگریز درسگاہوں کا بھی استعمال کررہے تھے،

ہندوستان کے شیر دل حکمراں سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے اپنے کچھ ہندوستانی حریصوں ہندوستانی غداروں کی مدد سے ۱۷۹۹ء میں زیر کیا اور میدانِ جنگ میں اپنے قلعہ کے سامنے سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے شہید کیا، اور انہیں جب یقین ہوگیا کہ سلطان ٹیپو اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہے تو انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے'' یعنی آج صرف سلطان ٹیپو ہی نے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ ہندوستان نے شکست کھائی ہے اور ہمیں دلی پر قبضہ کرنے سے کوئی

روک نہیں سکتا۔ سلطان ٹیپو وہی شخص ہے جس کا یہ مقولہ بار بار یاد آرہا ہے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے ''یعنی جیو تو شیر کی طرح جیو، گیدڑ جیسی زندگی نہ گزارو۔

یہی مقولہ علامہ فضلِ حق خیر آبادی نے انگریزوں کے سامنے اُس وقت کہا تھا جب کہ شاہ جہانی جامع مسجد دہلی میں علامہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف تقریر کی اور پھر جہاد کا فتویٰ جاری کیا تو دہلی میں تو ّے ہزار سپاہ جمع ہوگئی، اُس وقت انگریزوں نے کہا تھا کہ حضرت آپ اپنا فتویٰ واپس لے لیں تو میں آپ کو مال ومتاع اور جواہرات سے مالا مال کردوں گا، تو علامہ نے برجستہ کہا تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے، حضرت نے فرمایا کہ دنیا کا تمام مال ہمارے پاس لاکر رکھ دوگے پھر بھی ہم اپنا فتویٰ واپس نہیں لے سکتے کیوں کہ شریعت کا حکم حتمی ہوتا ہے، اسی طرح جہاد کے موضوع پر ایک اور فتویٰ جاری ہوا جس پر مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کا بھی دستخط تھا، مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی نے مرادآباد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، اور آس پاس کی مختلف جگہوں میں اُسے مشتہر کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا، بدایوں میں مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی نے جہاد کے لیے علمائے کرام کا بیان جاری کیا، متعدّد مقامات پر اپنے اپنے طور پر علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب وتحریک کی اور یہ سب کے سب علمائے اہلِ سنت تھے ۔اور سوادِ اعظم اہلِ سنت کی قیادت ورہنمائی انہیں علمائے اہلِ سنت نے کی (تفصیل وتحقیق کے لیے ملاحظہ کریں ۱۸۵۷ء پس منظر وپیش منظر: یٰسین اختر مصباحی مطبوعہ دارالقلم ذاکر نگر دلی)

کچھ غیر مقلدین اور دیوبندی حضرات اپنے اپنے پیشوا کے اسماء ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کا تحریکِ آزادی میں نمایاں کردار رہا ہے، یہ باتیں تعصب کی عینک پہن کر وہی لوگ کرتے ہیں جو تاریخ سے بالکل کورے ہیں۔کیوں کہ بالاکوٹ میں ۱۸۵۷ء میں قبائلی مسلمانوں کے ہاتھوں یہ دونوں قتل ہوئے تھے، پھر ۱۸۵۷ء میں یہ دونوں کیسے زندہ ہوگئے؟ جب کہ اِن کا عقیدہ ہے کہ انسان مرکر مٹی میں مل جاتا ہے، اور حد تو یہ ہے کہ ہیرو بھی بن گئے، ایک انسان کو طوقِ لعنت ختم کرکے حق بیانی کرنی چاہیئے کیوں کہ عنداللہ ہمیں خدا کی بارگاہ میں اپنا اپنا منھ دکھانا ہے ،ان دونوں نے نہ صرف یہ انگریزوں کے خلاف کوئی فتویٰ دینے یا اُن سے کوئی جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ تحریراً وتقریراً انگریزوں کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے دشمن سکھوں اور افغانی مسلمانوں سے جنگ کی، کوئی معمولی سے معمولی روایت کسی بھی مورخ کی ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ انھوں نے انگریزوں سے کسی طرح جھڑپ کی ہو، اور ان کے حلاف کسی طرح کا کوئی پروپیگنڈہ کیا ہوا، یا ایسا کوئی اقدام کیا ہو جس کی بنیاد پر انھیں انگریز مخالف کہا جاسکے خود ان کے حامی علما ومورخین لکھتے ہیں کہ ہندوستان سے سرحد کی طرف پیش قدمی کے وقت انگریزوں نے مختلف حیلوں اور تدابیروں سے ان کی مدد کی اور حوصلہ افزائی کی (ملاحظہ کیجیے، سوانح احمدی وحیات عجیبہ وغیرہ)

۱۸۵۷ء میں دہلی کے اندر مسلسل ساڑھے چار ماہ تک کی جنگ ہوئی ،جنگ پھیلی تو پوری مذہبی قیادت علمائے اہلِ سنت وجماعت نے کی، اس میں جنرل بخت خان روہیلہ، علامہ فضلِ حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی وغیرہ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ اس کے بعد ''روہیل کھنڈ'' (بریلی وپیلی بھیت ومرادآباد وبدایوں وشاہ جہاں پور وغیرہ) میں لڑی گئی، دلی کا پورا محاذ دلی کے سنی علما اور سپہ سالاروں نے سنبھالا اور ساری کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد بریلی میں جو جنگ لڑی گئی خان بہادر خاں، حافظ رحمت خان روہیلہ (شہید ومدفون بریلی) کے پوتا تھے اور حافظ رحمت خان روہیلہ صرف ایک سپہ سالار نہیں تھے بلکہ سنی حنفی مجاہد اور متبع شریعت بھی تھے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے جوشِ انتقام کے نتیجے میں علماء سے لیکر عوام تک سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے خون بہائے گئے، جن کو الگ الگ تحقیقات سے تاریخِ آزادی میں بیان کیا گیا ہے ،ان گورے جسم والوں کے بہیمانہ اور سفاکانہ انداز کو دیکھ کر اور پڑھ کر آج بھی اشک آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں، عوام الناس تو تھے ہی، علمائے کرام کے ساتھ ان کے قابلِ مذمت وحقارت سلوک کے بارے میں پڑھنے کے بعد جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جہادِ حریت میں جو علما شریک ہوئے یا جن پر کسی طرح سے شرکت کا شبہ ہوا، انہیں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان کی جائداد اونے پونے نیلام کی گئی، املاک تباہ کیے گئے، مکانات زمین بوس کرواکے ہل چلوائے گئے، جلاوطنی، کالا پانی کی قید یا مشقت برداشت کرنی پڑی، جیل خانہ کی آہنی سلاخوں میں جکڑے گئے تہ خانوں میں بے آب ودانہ تڑپا تڑپا کر مارے گئے، دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے، گرم گرم تیل کے کڑاہوں میں ڈالے گئے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندائے گئے، (باقی، ص:۳۱ پر)

حافظِ ملت کی شخصیت سازی پر ایک نظر

مولانا ثناء اللہ اطہر مصباحی

علم و حکمت، فضل و تدبر، اخلاص و وفا اور عشقِ رسول کے مجموعے کا نام حافظِ ملت حضرت علامہ عبد العزیز محدث مبارک پوری علیہ الرحمہ ہے۔ آپ کا پاکیزہ خیال آتے ہی ذہن و فکر کے نہاں خانے میں کیف و سرور کا اجالا پھیل جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی حسین تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔

اہلِ علم و دانش پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ دین و سنیت کی ترویج اور علوم نبوت کے فروغ و استحکام میں آپ کا چہیتا ادارہ جامعہ اشرفیہ نے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ بلا تامل و تردد برصغیر ہندو پاک میں ایک نمونہ اور مثال بن گیا ہے۔ یقیناً اس کے علم و فکر کا فیضان گھٹا بن کر سارے عالم پر برس رہا ہے۔ حافظِ ملت کی متنوع شخصیت اور گوناگوں خدمات پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے اور یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں۔ موضوع کے تقاضے کے پیشِ نظر آنے والے سطور میں میری گفتگو آپ کی شخصیت سازی کے حوالے سے ہی ہوگی۔

شخصیت سازی اور شخصیت کی تعمیر کا مفہوم اپنے دامن میں بڑی وسعت سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ افراد و تلامذہ کو اخلاص و دیانت داری کے ساتھ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا، ان کی صلاحیتوں کو نکھارنا، حوصلہ افزائی کرنا، قدم قدم پر مفید مشوروں سے نوازنا اور آگے بڑھنے کے لیے ہر طرح سے راستہ ہموار کرنا، یہ ساری باتیں مذکورہ مفہوم میں شامل ہیں۔ یہ وصف نہایت ہی کشادہ ظرفی اور وسعت نظری کے ساتھ غیر معمولی اخلاص و وفا کا متقاضی ہوتا ہے۔ حافظ ملت کے اندر یہ وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس وصف خصوصی کی بنیاد پر انھوں نے وہ عظیم کارنامے انجام دیے جو صدیوں پر پھیلی ہوئی غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ میں دیکھنے کو میسر نہیں آتی۔ علامہ قمر الزماں اعظمی رقم طراز ہیں:

"تلاش بسیار کے بعد ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں میں کوئی ایسا فردِ کامل نہیں ملتا جس نے اپنی زندگی میں ایک درس گاہ قائم کی ہو اور اس کی حیات ہی میں اس درس گاہ کے طلبہ اور فارغ التحصیل علما نے غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں ہزاروں درس گاہیں قائم کر دی ہوں اور اس اولین درس گاہ کا بانی اپنے مولائے حقیقی کے حضور اس وقت پہنچا ہو جب کہ ملک کا گوشہ گوشہ اس کی تعلیمات کا امین اور اس کے دینی نظریات کا علم بردار ہو۔"(۱)

حافظِ ملت کے جن عظیم کارناموں کی طرف مذکورہ اقتباس میں علامہ اعظمی اشارہ کر گئے ہیں، ان کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں حافظِ ملت کی شخصیت سازی کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف دار العلوم اشرفیہ اور جامعہ اشرفیہ قائم کر کے علما و مشائخ کی جماعت پیدا کی بلکہ جماعت کی ذہنی و فکری تعمیر، طلبہ کی عمدہ تربیت سازی، مناسب رہنمائی، حوصلہ افزائی اور ان کو ہر جہت سے تراش خراش کر علم و دانش اور فضل و حکمت کا ایسا قیمتی نگینہ بنا دیا جس کے لمعات سے جہالت و تاریکی کے ویرانوں میں علومِ نبویہ کے اجالے پھیل گئے۔ حافظ ملت اس حقیقت سے خوب آشنا تھے کہ تلامذہ کی پر سوز تربیت اور رہنمائی ہی کوئی بڑا انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے تلامذہ کو صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ فرما کر رخصت کر دیتے تو قابلِ فخر اور جلیل القدر علما کا زبردست کارواں کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے حافظِ ملت جلوت و خلوت، اقامت و سفر، درس گاہ و جلسہ گاہ، محفلِ خاص اور مجمعِ عام میں ہر جگہ ہر وقت اپنے فریضۂ عشق کی بجاآوری میں سرگرداں رہے اور اس وصف خاص میں وہ اپنے ہم سفروں سے ہزاروں میل آگے نکل گئے۔

اس ضمن میں علامہ ارشد القادری قدس سرہ کا یہ اقتباس قابلِ مطالعہ ہے۔

"حافظ ملت کی زندگی کا سب سے نمایاں جوہر اپنے تلامذہ کی پر سوز تربیت اور ان کی شخصیتوں کی تعمیر ہے۔ اپنے اس وصف خاص میں وہ اتنے منفرد ہیں کہ دور دور تک کوئی ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔" (۲)

"تاج محل کی تعمیر آسان ہے، لیکن شخصیتوں کی تعمیر کا کام بہت مشکل ہے۔ حافظِ ملت کو اس کام سے عشق کی حد تک تعلق تھا۔ سفر میں، حضر میں، حلقۂ درس میں، مجلسِ خاص میں، جلسۂ عام میں کہیں بھی وہ ایک لمحے کے لیے اپنے اس فریضۂ عشق سے غافل نہیں رہتے تھے۔" (۳)

حافظِ ملت کا کمال یہ تھا کہ تدریسی خدمات اور دیگر مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے تلامذہ پر خصوصی توجہ فرماتے، ان کی ذہنی و فکری ارتقا

کے لیے مناسب نصیحتیں کرتے۔ ان کی صلاحیتوں کو سراہتے۔ ان کے حسنِ فن کو صیقل کرتے اور جس طالب علم کو جس فن میں دل چسپی لیتے دیکھتے اس کو اسی فن کا ماہر بنانے کے لیے راہیں ہموار کر دیتے۔ اگر کسی کے اندر درس و تدریس کا شغف دیکھا تو اسے کسی معیاری درس گاہ کے مدرس کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ اگر کسی نے تقریر و خطابت کے میدان میں آگے بڑھنا چاہا تو اسے اپنے ساتھ جلسوں میں لے گئے، تقریریں کرائیں اور تحسین و آفریں کے جملوں سے نوازا۔ اگر کسی کے اندر ادارہ سازی اور تعمیری کاموں کو بحسن و خوبی انجام دینے کی صلاحیت محسوس کی تو اسے ایسے علاقے میں بھیج دیا جہاں وہ علومِ اسلامیہ کا شان دار قلعہ تعمیر کر کے علومِ نبویہ کا فیضان عام کر سکے۔ اگر کسی میں قرطاس و قلم سے وارفتگی دیکھی تو اس کو تصنیف و تالیف اور تحریر و صحافت کی دنیا میں آگے بڑھا دیا۔ الغرض طلبہ کے شوق و ذوق اور ذہانت و فطانت کی مناسبت سے آپ میدانِ عمل کی تعیین فرما دیتے۔ اس مقام پر اہلِ فکر و نظر کو اس امر کا معترف ہو جانا پڑتا ہے کہ شخصیت سازی اور جوہر شناسی جو قدرت کی ایک خاص عطا ہے، حافظِ ملت کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی تھی۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی رقم طراز ہیں:

"آپ کی زندگی کی ایک شاہکار خصوصیت یہ بھی ہے کہ مبارک پور کی درس گاہ علم و فن سے ایسے طلبہ کی ایک خاص نہج پر تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی گئی جو علمِ دین کے متعدّد شعبوں میں اپنی صلاحیت کا استعمال کر کے کچھ مثالی خدمات انجام دے سکیں۔ آپ کے اندر جوہر شناسی کی خاص خوبی تھی۔ طلبہ کی ذہانت و زیرکی، محنت اور کد و کاوش، سلامتِ فطرت پر رجحان طبع، بلند خیالی، میدانِ عمل کی تعیین، ان سب چیزوں کو حافظِ ملت قدس سرہ کی دور بیں نگاہیں ایک ہی نظر میں تاڑ لیتیں۔"(۴)

حضرت علامہ ارشد القادری تحریر فرماتے ہیں:

"جس خصوصیت میں انھوں نے اپنے عصر ہی نہیں بلکہ اپنے ماضی کے بھی ہزاروں علما کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے، وہ ہے ان کی مردم سازی اور نسل انسانی کے احیا کا مشن، اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ اس کا تسلسل موت کا فرشتہ بھی نہیں توڑ سکا۔ علم و آگہی اور شخصیت سازی کا جو چشمۂ فیضان ان کی حیاتِ ظاہری میں جاری تھا، وہ آج بھی جامعہ کے احاطے میں ابل رہا ہے۔"(۵)

ان دنوں کی بات ہے جب دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کا چندہ قصبہ مبارک پور میں رجزیہ نظموں کے ترانے کی گونج میں ہوا کرتا تھا۔ حافظِ ملت بنفسِ نفیس اس قافلے میں جلوہ افروز ہوتے۔ اشرفیہ کے دیگر اساتذہ، طلبہ، اراکین و معاونین کی ایک جماعت بھی ساتھ ہوتی تھی۔ جب نظموں کے گجرے مبارک پور کی گلیوں میں گونجتے تو کیف کا سماں چھا جاتا اور اس وقت اعوان و انصار مبارک پور کے ایثار و قربانی کا عالم قابلِ دید ہوا کرتا تھا۔ ان ہی ایام میں ایک دن اشرفیہ کے ایک طالب علم کی نظم پڑھی گئی جس کے مقطع میں ارشد کا نام آیا۔ حافظِ ملت نے فرمایا: یہ ارشد کون ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ وہ غلام رشید ہے۔ حافظِ ملت اس کی نظم گوئی سے بے حد مسرور ہوئے اور قریب بلا کر اسے دعائیں دیں اور انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ آگے چل کر وہی غلام رشید رئیس القلم علامہ ارشد القادری بن کر نثری کارناموں کے علاوہ نظم کے میدان میں بھی اپنی خوب صورت یادوں کے نقش چھوڑ گئے۔ حافظِ ملت کے اس الطاف و اکرام کا حضرت علامہ پر بڑا گہرا اثر پڑا اور اس واقعے کے بعد شعر و شاعری کی طرف ان کا اشتیاق بڑھتا چلا گیا۔ علامہ ارشد القادری اس دل ربا منظر کی تصویر کشی ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"ایک دن میری نظم بھی کافی متاثر ہو گئی اور خوب چندہ ہوا۔ یوں سمجھیے کہ روپے برسنے لگے۔ ایک دو اشعار اس میں ایسے تھے کہ لوگ اس کو بار بار پڑھواتے اور خوب نعرہ لگاتے... اس وقت حافظِ ملت پر بھی ایک عجیب رقت طاری ہو گئی۔ جب مقطع پڑھا گیا تو اس میں ارشد کا نام آیا۔ حافظِ ملت نے پوچھا یہ ارشد کون ہے؟ کسی نے کہا: وہ غلام رشید ہے۔ فرمایا: کہاں ہے بلاؤ بلاؤ۔ میں قریب ہی اپنی نظم سننے کے لیے کھڑا تھا۔ خیر میں آیا تو حضرت نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور انعام بھی دیا جس سے اور بھی اشتیاق بڑھا۔"(۶)

حضرت علامہ ارشد القادری نے مذہبی صحافت کی دنیا میں اہلِ سنت کی سچی نمائندگی کا فریضہ انجام دینے کے لیے ۱۹۶۶ء میں کولکاتا سے پندرہ روزہ رسالہ "جامِ کوثر" کا اجرا فرمایا اور اس کا پہلا شمارہ اپنے استاذ و مربی حضور حافظِ ملت کی خدمت میں ارسال کیا۔ حافظِ ملت اس رسالہ کی اشاعت پر مسرت سے جھوم اٹھے اور علامہ کے نام ایک مکتوب رقم فرمایا۔ حضرت کے خط کے ایک ایک لفظ سے شخصیت سازی اور حوصلہ افزائی کا چشمہ ابلتا ہے۔ طوالت کا خوف پیشِ نظر ہے ورنہ پورا خط نقل کر دیتا۔ تسکینِ ذوق کے لیے خط کا ایک مختصر ٹکڑا حاضر ہے، ملاحظہ ہو:

"میری دلی منشا اور قیمتی مشورہ ہے کہ مسلمان اس کو اس طرح اپنائیں کہ جامِ کوثر ہر مسلمان کے گھر میں رہے اور ہر ہر پرچہ محفوظ رہے۔"(۷)

مذکورہ اقتباس کو پھر پڑھیے۔ کیا کسی رسالے کے مدیر کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے اس سے خوب صورت اور قیمتی جملے معرضِ اظہار میں آسکتے ہیں؟

حافظِ ملت کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ صرف اپنے تلامذہ اور

شاگردوں کے کارناموں پر ہی فخر و مسرت کا اظہار نہیں فرماتے بلکہ اپنی جماعت کا کوئی بھی عالم دین مذہب و مسلک کی ترویج و اشاعت کا نمایاں فریضہ انجام دیتا تو آپ کی فرحتوں کا عالم قابلِ دید ہوا کرتا۔ ان پر بھی آپ کی شفقت و الطاف کے پھول برس پڑتے۔ علامہ مشتاق احمد نظامی نے جب ستمبر ۱۹۵۳ء میں ماہ نامہ "پاسبان" الہ آباد کا دوبارہ اجرا کیا تو حافظِ ملت بہت خوش ہوئے۔ علامہ نظامی کی صحافتی خدمات کا اعتراف انشراحِ صدر کے ساتھ کیا۔ حوصلہ افزائی کی اور نیک دعاؤں سے سرفراز فرمایا۔ حافظِ ملت کا علامہ نظامی کو لکھے گئے خط کا یہ اقتباس مذکورہ حقائق کا غماز ہے:

" پاسبان کی دوبارہ زندگی سے بے حد مسرت ہے، پاسبان بڑا ہی زریں مقصد لے کر اٹھتا ہے۔ دین و ملت کی پاسبانی کرنا چاہتا ہے۔ مولائے کریم اس کو ثبات و دوام اور استحکام عطا فرمائے اور اسی مقصد کے تحت چلنے کی توفیق رفیق بخشے۔"(۸)

ایک مرتبہ موضع ابراہیم پور ضلع اعظم گڑھ کی سرزمین پر حافظِ ملت کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ ان دنوں مولانا عبید اللہ خان اعظمی خطابت کے آفاق پر دھیرے دھیرے ابھر رہے تھے۔ حافظِ ملت کے اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے سے پیش تر مولانا اعظمی نے دل کش اور دل افروز الفاظ و تراکیب کے پھولوں سے سجا کر سلاست و روانی سے دھلی ہوئی حسین و خوب صورت زبان میں ولولہ انگیز خطاب کر کے ایک کیف کا سماں باندھ دیا۔ حافظِ ملت جب اسٹیج پر تشریف لائے تو اس موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں مولانا اعظمی کو تقریر کی مشین کہہ کر یاد فرمایا۔ حافظِ ملت کی زبان فیض ترجمان سے نکلا ہوا یہ جملہ حرف بحرف ثابت ہو کر رہا۔ اس جلسے میں علامہ بدر القادری مصباحی بھی موجود تھے۔ ان دنوں وہ اشرفیہ مبارک پور کے طالب علم ہوا کرتے تھے۔ علامہ بدر القادری رقم طراز ہیں:

"ہم لوگ اس انتظار میں رہے کہ دیکھیے حضرت انھیں کس انداز میں سراہتے ہیں اور کس طرح ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ حافظِ ملت کی صدارتی تقریر شروع ہوئی تو انھوں نے مولانا اعظمی کے بارے میں فرمایا: "ماشاء اللہ حافظ عبید اللہ صاحب تقریر کی مشین ہیں" حضرت کے یہ الفاظ سن کر ہم لوگ حیران رہ گئے اور آج پورے ہندوستان کو اس بات کا یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ مولانا اعظمی واقعی تقریر و خطابت کی مشین ہیں۔"(۹)

حافظِ ملت کی زندگی میں ایک اہم بات یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ آپ صرف اپنے قریب رہنے والے طلبہ اور علما پر ہی شفقت و محبت اور لطف و کرم کی نظر نہیں رکھتے بلکہ اگر کوئی دینی خدمات انجام دینے کی غرض سے دور بھی چلا جاتا تو آپ کی عنایت و نوازش کا سایہ اس پر دراز رہتا۔ خط و مراسلہ کے ذریعہ اس کی خبر رکھتے، قدم قدم پر اس کی رہ نمائی کرتے، محنت و مشقت کے ساتھ فرائض کی ادائیگی کی تلقین کرتے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر اس کے پہنچنے کی آرزو اپنے نہاں خانۂ دل میں پنہاں رکھتے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک شفیق باپ اپنے ارجمند بیٹے کے تئیں اپنے قلب و جگر میں الفت و محبت اور شوق و تمنا کا چراغ جلائے رکھتا ہے۔ حافظِ ملت کی اس خصلتِ کریمہ نے ہزاروں علما کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ نتیجے کے طور پر وہ حضرات بھی حافظِ ملت کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ گئے اور زندگی کے ہر موڑ پر آپ کے مفید مشوروں کی روشنی میں اپنے کاروانِ زیست کو آگے بڑھانے کے عادی بن گئے۔ نمونے کے طور پر یہاں حافظِ ملت کے اس خط کا اقتباس پیش کرنا دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا جسے آپ نے علامہ بدر القادری مصباحی کو اس وقت ارسال فرمایا تھا جب وہ فضیلت کی تکمیل کے بعد آپ کے ایما پر تدریسی خدمات انجام دینے انگولا پہنچے تھے۔ اس خط میں الفت و محبت، پند و نصیحت اور شفقت و نوازش کے ساتھ حوصلہ افزا کلمات میرے مذکورہ دعوے کی صداقت پر غماز ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"مجھے آپ کی سعادت مندانہ صلاحیتوں سے قوی امید ہے کہ آپ کارِ لائق کو بحسن و خوبی انجام دیں گے۔ اراکین و ذمہ داران کو اپنی دینی خدمات سے مطمئن کریں گے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے آپ کی جدائی سے قلق ہے، یہ آپ کے والد ماجد کا کرم ہے۔ بہر حال آپ اپنا ادبی مشن جاری رکھیں۔ کتابیں ضرور دیکھتے رہیں۔ مطالعہ سے ترقی ہوتی ہے۔"(۱۰)

حافظِ ملت کا اپنے تلامذہ سے غیر معمولی الفت و محبت اور اخلاص و ہمدردی کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے تلامذہ بھی ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور اپنی تعلیمی و ارتقائی امور سے متعلق ایک ایک بات کی اطلاع حافظِ ملت کو فراہم کرتے رہے۔ حافظِ ملت بھی کھلے دل سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور مشکل امور کی بجا آوری کے طریقے بتاتے نیز کامیابی کے لیے دل سے دعائیں دیتے رہتے۔

حضرت علامہ محمد احمد مصباحی جن دنوں مدرسہ فیض العلوم جمشید پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، ان ہی دنوں علامہ موصوف نے حافظِ ملت سے مزید علم کی تحصیل اور جدید عربی کی مہارت کے سلسلے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا تو حافظِ ملت نے بڑی فرحت و انبساط کا اظہار کرتے ہوئے یہ حوصلہ کن جواب ضبطِ تحریر فرمایا:

"حصولِ کمال کا ذوق معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی، مولائے قدیر پورا فرمائے۔ ہر فن میں کمال عطا فرمائے۔ عربی ادب کی خود ہی کوشش

کرتے رہیں۔ باہر جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ اپنی سعی سے کم از کم قدیم عربی پر قدرت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مدیر کے لیے بھی کوئی سبیل نکل آئے گی۔"(۱۱)

حافظِ ملت کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ صرف اپنے مدرسہ کے طلبہ کی کامیابی پر ہی مسرتوں کا اظہار نہیں فرماتے بلکہ کسی بھی ذی استعداد طالب علم کی صلاحیت دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی میں غیر معمولی دل چسپی کا مظاہرہ فرماتے۔ ایک مرتبہ حافظِ ملت دار العلوم عتیقیہ تلسی پور، ضلع گونڈہ طلبہ کا امتحان لینے کے لیے تشریف لے گئے۔ کافیہ کا امتحان لیتے وقت ایک طالب علم سے آپ نے سوال کیا کہ فاعل کی تعریف میں تقدیم فعل کی قید کیوں لگائی گئی ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ فاعل اور مبتدا میں امتیاز کے لیے یہ قید لگانا ضروری ہے۔ نحوی سوال کے اس خوب صورت جواب پر حافظِ ملت بے حد مسرور و شاداں ہوئے اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں آپ نے اس طالب علم کی ایسی حوصلہ افزائی فرمائی جس نے اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ پھر وہ حافظِ ملت سے اکتسابِ فیض کے لیے اشرفیہ مبارک پور میں داخل ہو گیا۔ آگے چل کر وہی طالب علم مفسر قرآن علامہ عبد اللہ خان مصباحی کی شکل میں معروف و متعارف ہوئے۔(۱۲)

مختصر یہ کہ حافظِ ملت نے اپنے اپنی کامل تربیت اور عمدہ شخصیت سازی سے ہزاروں فرزندان توحید کو قابلِ فخر اور لائق رشک بنا دیا۔ حافظِ ملت کے مذکورہ طریقۂ کار کو نمونۂ عمل بنا کر آج بھی بڑے سے بڑا انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جوات:

(۱)-حافظِ ملت نمبر، ص:۳۳۸
(۲)-ایضاً، ص:۱۲۲
(۳)-ایضاً، ص:۱۲۳
(۴)-ایضاً، ص:۳۹۶
(۵)-انوار حافظِ ملت، ص:۱۹
(۶)-ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی، ص:۱۱
(۷)-حیاتِ حافظِ ملت، ص:۴۸۹
(۸)-ایضاً، ص:۴۹، ۵۰
(۹)-ایضاً، ص:۳۱۴، ۳۱۵
(۱۰)-ایضاً، ص:۴۹۴
(۱۱)-ایضاً، ص:۴۹۳
(۱۲)-ملخصاً حیات، حافظِ ملت، ص:۳۱۵

☆☆☆☆☆☆

ص:۲۷/ کا بقیہ.....

غرض کہ مصائب و آلام کے تمام حربے ان پر آزمائے گئے۔ مگر واہ رے ہمت مومنانہ، ان میں سے ایک بھی قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ ان روح فرسا مناظر کا چشم دید گواہ انگریز مورخ ایڈورڈ ٹامسن اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"۱۸۶۴ سے ۱۸۶۷ء تک انگریزوں نے علما کو ختم کرنے فیصلہ کیا اور یہ تین سال ہندوستان کی تاریخ کے بڑے المناک سال ہیں، ان تین سالوں میں انگریزوں نے ۱۴، چودہ ہزار علما کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ دلی کے چاندنی چوک سے خیبر تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علماء کرام کی گردنیں نہ لٹکی ہوں۔ علما کے جسم کو تانبے سے داغا گیا، سوّر کی کھال میں لپیٹ کر جلتے ہوئے تندور میں ڈالا گیا، ہاتھیوں پر کھڑا کر کے درختوں سے باندھ کر ہاتھیوں کو نیچے سے چلا دیا۔ (جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز ص:۵۶)

ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا، اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا، اور وہی سلوک اس کے ساتھ کیا گیا جو مندرجہ بالا سطور میں آپ ملاحظہ کر چکے۔

مجاہدینِ آزادی نے ظلم و استبداد برداشت کرنے کے جو نمونے پیش کیے وہ ان ہی کا حصہ تھا انگریزوں کے جبر و استبداد کی یہ ہلکی سی جھلک تھی ورنہ انہوں نے اس سے بھی دردناک مظاہرے کیے تھے۔ وطن عزیز کی آزادی کے لیے علمائے اہلِ سنت کی قربانیاں فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ آج اس انقلاب کو ڈیڑھ سو سال پورے ہو چکے ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تحریکِ آزادی کے شہدا کو یاد کریں اور ان کے زریں کارناموں اور جاں نثاریوں سے عوام الناس بطور خاص نوجوان نسل کو واقف کرائیں۔ آج ہماری وفاری وطن کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں اور زیادہ ضرورت ہے کہ ہم آزادی کی تحریک کے تئیں مسلمانوں کے جذبات کو تاریخ کے حوالے سے متعارف کرائیں اور ثابت کر دیں کہ عزت سے ہم بھی جینے کے حق دار ہیں۔••••

حافظِ ملت کا اسلوبِ تحریر

محمد طفیل احمد مصباحی

اردو نثر کے ابتدائی نقوش کے مطالعے اور جائزے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اردو زبان میں نثر کے دو مخصوص اسالیب ”نثرِ مرصع“ اور ”نثرِ سادہ“ ابتدائی زمانے سے ہی رائج و مقبول رہے ہیں۔ اپنے ذوق و وجدان کے مطابق ہر ادیب و فنکار نثرِ مرصّع اور نثرِ سادہ کے ذریعہ اردو کے تنگ دامن کو وسیع کرتے رہے۔ اردو کے عہدِ قدیم اور عہدِ متوسط میں بعض تمدنی اسباب کے پیش نظر ”نثرِ مرصع“ زیادہ مقبول و مروج رہی۔ ملا وجہی کی ”سب رس“ اور رجب علی بیگ کی ”فسانۂ عجائب“ تک نثر کا یہی مرصّع و مقفیٰ اور پُر تکلف اسلوب مرغوب تھا۔ کربل کتھا، دیباچۂ سودا، نوطرزِ مرصّع، داستانِ جذب و عشق اور دیباچۂ عشرت بریلوی کی نثر بڑی مرصّع، پر تکلف، ژولیدہ اور عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے بوجھل ہے۔

نثرِ مرصع کے ساتھ نثرِ سادہ کا بھی برابر اپنا ارتقائی سفر جاری رہا، دکنی عہد میں اسلامیات اور اخلاق و تصوف پر جو ابتدائی اردو کتب و رسائل وجود میں آئے، مثلاً احکام الصلوٰۃ، کلمۃ الحقائق، شرحِ تمہیداتِ ہمدانی وغیرہ، ان کی زبان سادہ ہے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی عیسوی میں تفسیرِ مرادیہ، عجائب القصص، قصہ مہر افروز، نوآئینِ ہند اور دیگر تراجمِ قرآن بالکل سادہ نثر میں لکھے گئے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج سے اردو میں ”سادہ نثر نگاری“ کی تحریک پروان چڑھی اور انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سادہ اسلوبِ نگارش کو وقار اور اعتبار و استناد کا درجہ حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں کے بعد ہی ادبی حلقوں میں پہلی بار سادگی بلفظ دیگر ”سادہ نثر اور سادہ اسلوبِ تحریر“ کو نثر کی خوبی اور نثر نگار کی بڑائی تسلیم کیا جانے لگا۔ آج بھی عام قارئین سادہ نثر کو پسند کرتے ہیں اور ادب کا سنجیدہ طبقہ مسجّع و مقفیٰ الفاظ و تراکیب کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے۔

اردو کے قابلِ ذکر ادبا کی طرح علماے اہلِ سنت اور مشائخِ ملت کی تحریروں میں بھی عہد و ماحول کے زیر اثر نثرِ مرصع اور سادہ نثر کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ماضی قریب کے ہمارے بیش تر علما و مشائخ کی نگارشات مرصّع، عربیت زدہ اور فارسی الفاظ و تراکیب سے بوجھل ہیں۔

مرصع نثر کوئی معیوب شے نہیں بلکہ اردو نثر کا ایک خاص اسلوب، ادیبانہ پیرایۂ اظہار اور ابلاغ و ترسیل کا ایک جمالیاتی پہلو ہے، جسے ادیب و فنکار اپنے مزاج و ظرف کے لحاظ سے اپناتا ہے اور خوب صورت الفاظ و تراکیب کے ذریعے حسین اور پرکشش جملوں کا پیکر تراشتا ہے۔ جس طرح شاعری کے رنگ و آہنگ اور طرز و اسلوب مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح نثر کے بھی متنوع اسالیب، مختلف پیرایۂ بیان اور بوقلموں طرزِ اظہار ہوتے ہیں۔ ایک کامیاب ادیب اور عظیم فنکار موقع و محل کی مناسبت سے رنگین، پُر تکلف، مسجع و مقفیٰ اور جمالیاتی عناصر سے مملو اسلوب اختیار کرتا ہے، جسے پڑھ کر قاری فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے اور ادبی چاشنی سے محظوظ ہوتا ہے۔ خطیبِ مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، رئیس القلم علامہ ارشد القادری، سعادتِ لوح و قلم پروفیسر مسعود احمد مجددی کی تحریروں میں نثرِ سادہ کے ساتھ ”نثرِ مرصع“ کی جلوہ سامانیاں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں اور قلب و نظر کو سکون فراہم کرتی ہیں۔

جلالۃ العلم، استاذ العلما، حافظِ ملت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مراد آبادی قدس سرہ ماضی قریب کے ایک عظیم علمی و روحانی شخص تھے۔ قادرِ مطلق نے آپ کو علم و حکمت، فضل و کمال، ذہانت و طبّاعی، تدبر و تفکر اور عزم و استقلال کے علاوہ محبت و شفقت، حلم و مروت، جود و سخاوت، حسنِ اخلاق اور خوبیِ کردار کی لازوال قوتوں سے نوازا تھا۔ آپ کی پوری زندگی درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور اسلام و سنیت

سب ایڈیٹر، ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور

کی تعمیر و ترقی میں گزری۔ بلا شبہہ حافظِ ملت ایک جامع صفات شخصیت تھے۔ دیگر بے شمار اوصاف و کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ آپ ایک عظیم مصلح، بلند پایہ خطیب اور تحریر و قلم کے رموز و آداب سے واقف ایک مایۂ ناز مصنف اور صاحبِ قلم تھے۔ آپ کی تحریر میں بلا کی متانت و سنجیدگی اور سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی نثر کے بعض حصوں پر "ادبِ عالیہ" اور اردوے معلیٰ" کا گمان ہوتا ہے۔

آپ قرطاس و قلم اور تصنیف و تالیف کو دین و سنیت کے فروغ و استحکام کے لیے ایک مستحکم ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری و عملی اعتبار سے آپ اس میدان میں پیش پیش رہے اور اپنے خامۂ زر نگار سے علم و حکمت، اسلامی اخلاق و آداب اور اہلِ سنت کے عقائد و معمولات کی چاندنی صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے رہے۔ آپ بارہا فرمایا کرتے کہ: تقریر سب سے آسان کام ہے، اس کے بعد درس و تدریس اور سب سے مشکل تحریر اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ ہے۔

حضور حافظ ملت دیگر اوصاف و کمالات کے ساتھ "تصنیفی صلاحیت" اور "قلم کی قوت" سے بھی سرفراز کیے گئے تھے۔

اس سلسلے میں تحدیثِ نعمت کے طور پر آپ خود فرماتے ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ تصنیفی صلاحیت مجھے ضرور ملی اور قلم کی قوت بھی۔ کیا کہوں! مجھے لکھنے پر قدرت تھی، جس کا نمونہ "العذاب الشدید" ہے۔ اسے "مقامع الحدید" کے جواب میں چند ایام کی مختصر مدت میں تیار کیا۔ مگر چوں کہ عجلت میں لکھا تھا، اس لیے خاطر خواہ نہ ہوئی۔ کتاب اپنے تلمیذ مولانا محبوب احمد صاحب کے نام سے منسوب کر دی۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ نے کتاب دیکھ کر فرمایا: کتاب بڑی معرکۃ الآرا اور جلیل القدر ہے۔ حافظ صاحب (حافظِ ملت) کو اسے اپنے نام سے شائع کرنا چاہیے تھا۔ رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ اس کتاب نے مجھے مناظرہ سکھایا۔ قوتِ تصنیف کے باوجود ہمیشہ عوائق و موانق در پیش رہے اور مصروفیات نے گھیرے رکھا جس کے باعث میں کچھ نہ لکھ سکا۔ (حافظِ ملت نمبر، ص:۱۷۶، مبارک پور)

عمدۃ المحققین حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ، حافظِ ملت کی قوتِ تحریر، تصنیفی ملکہ اور انشا پردازی سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں شبہہ نہیں کہ حضرت (حافظِ ملت) کی جو کچھ بھی تحریریں، مقالے اور خطوط وغیرہ پیش نظر ہیں، وہ "انشا پردازی" کا بہترین نمونہ ہیں۔ آپ کی مصروفیات سے سبھی اہلِ تعلق باخبر ہیں۔ ورنہ یقیناً وہ ہمارے لیے عظیم تصنیفی سرمایہ بھی ضرور چھوڑ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ حافظِ ملت نے اگرچہ زیادہ تصنیفات نہ چھوڑیں، مگر بے شمار مصنفین ضرور پیدا کر دیے۔ طلبہ کے اندر تحریری ذوق پیدا کرنے میں ہمیشہ ان کا زبردست ہاتھ رہا۔ خصوصاً جس طالب علم کے اندر تصنیفی صلاحیت اور تحریری ذوق دیکھتے اُسے اُسی طرف لگا دیتے۔ جس کے باعث آج حافظِ ملت کے تلامذہ میں اردو، عربی، فارسی کے جیّد اہلِ قلم دیکھے جاسکتے ہیں۔" (حافظِ ملت نمبر، ص:۱۷۶، ۱۷۷)

گویا حافظِ ملت اس شعر کے مصداق تھے:

مثالِ شمس تھے ہم بھی کہ جب غروب ہوئے
تو بے شمار ستاروں کو جگمگا کے چلے

فنی اعتبار سے کسی ادیب و شاعر اور فن کار کے ادب پاروں کی قدر و قیمت متعیّن کرنا اور ان کی نثری خصوصیات و اسالیب پر روشنی ڈالنا ایک محقق اور نقّاد کا کام ہے۔ راقم اس منصب کے لائق نہیں۔ تاہم اپنی بساط کے مطابق حضور حافظِ ملت کی کچھ نثری خصوصیات اور آپ کے "اسلوبِ تحریر" پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اسلوب کیا ھے؟ تحریر و قلم اور تصنیف و تالیف کی دنیا میں "اسلوب" کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلوب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"اسلوب افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی ہو۔ اسی کو انگریزی میں اسٹائل (Style) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے "طرز" یا "اسلوب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اور جدید فارسی میں اسی کو "سبک" کہتے ہیں۔ ان الفاظ کی اصل پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب میں ترصیع یا صناعی (Ornamention) کا مفہوم شامل رہا ہے۔

طرزِ نگارش یا اسلوبِ تحریر شخصیت کے اظہار کا ذریعہ اور آئینہ ہوتا ہے، جس میں مصنف یا شاعر کے فکر و خیال اور ذوق و وجدان کا عکس صاف دکھائی پڑتا ہے۔ ڈاکٹر بوفان کا قول ہے: "اسلوب خود

انسان ہے" یعنی اسلوب کے ذریعہ مصنف کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اسلوب ہی وہ واحد معیار ہے جس کے سبب کسی مصنف اور قلم کار کے بارے میں یہ دو ٹوک فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ صاحبِ طرز ادیب ہے یا نہیں۔ آج ہر کس و ناکس کو صاحبِ طرز ادیب کہہ دیا جاتا ہے جو کہ غلط اور ایک ادبی گناہ ہے۔ ماضی قریب کے علماے اہلِ سنت میں رئیس القلم علامہ ارشد القادری اور پروفیسر مسعود احمد مجددی کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ کیوں کہ ان کا اسلوبِ تحریر خود ان کے "صاحبِ طرز ادیب" ہونے پر دال ہے۔ صاحبِ طرز ادیب بننے کے کے لیے اسلوب میں "انفرادیت" کا کمال پیدا کرنا ضروری ہے، جو بڑی محنت طلب اور ریاضت کا کام ہے۔

اسلوب کے متعلق ان تمہیدی کلمات کے بعد حافظِ ملت کی نثری خصوصیات اور اسلوبِ تحریر کے کچھ نمونے ہدیۂ قارئین ہیں۔

سادہ نثر: حافظِ ملت کی ذات مجموعۂ محاسن تھی۔ آپ کی کتابِ زندگی کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپ تصنیفی صلاحیت اور قلمی قوت کے جوہر سے مالا مال تھے۔ آپ جتنے بڑے عالم و محدث تھے، اتنے بڑے مصلح و مبلغ بھی تھے۔ اصلاحِ امت اور دین و سنیت کی ترویج و اشاعت کے لیے پوری زندگی کوشاں رہے۔ ہاتھ میں قلم سنبھالا تو اس نیت سے کہ قوم و ملت کی اصلاح ہو سکے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ امت کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دعوت و تبلیغ یُسر، آسانی اور سادگی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے آپ کی تحریر اور نثر "سادگی" کا بہترین نمونہ ہے۔ البتہ بعض مقامات پر "مرصع نثر" کی جلوہ گری بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اقسامِ نثر یعنی (۱) نثر مرصع (۲) نثر مرجز (۳) نثر عاری، میں سے آپ نے "نثر عاری" یعنی سادہ نثر کو ترجیح دی ہے اور حتی الامکان پر شکوہ الفاظ، رنگین عبارات، فارسی و عربی تراکیب سے بوجھل غیر مانوس پیرایۂ بیان سے اجتناب و احتراز فرمایا ہے۔ حافظِ ملت کی سادہ نثر نگاری کے نمونے آپ کی تمام کتابوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ "ارشاد القرآن" سادہ نثر نگاری کی منہ بولتی تصویر ہے۔

دو اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)- مسلمانو! جاگو اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ تمھاری صلاح و فلاح کا راز اسی میں مضمر ہے کہ تم سچے اور پکے مسلمان بن جاؤ۔ تمھاری کامیابی اسی پر موقوف ہے کہ تمھاری زندگی اسلامی زندگی اور موت اسلامی موت ہو۔ تمھاری صورت اسلامی صورت اور تمھاری سیرت اسلامی سیرت ہو۔ تمھارا ظاہر بھی اسلامی ہو اور تمھارا باطن بھی اسلامی۔ تمھارے عقائد اسلامی عقائد ہوں اور اعمال اسلامی اعمال۔ تمھارے جذبات اسلامی جذبات ہوں اور تمھارے خیالات اسلامی خیالات۔ تمھارا سینہ اسلامی انوار سے منور ہو اور تمھارا جسم اعمالِ صالحہ سے مزین۔ مصیبت پر صبر اور نعمت پر شکر تمھاری عادت ہو۔ اللہ عزوجل پر توکل و اعتماد تمھاری سرشت اور قرآنی تعلیمات پر عمل تمھاری طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔" (ارشاد القرآن، ص:۹)

(۲)- مسلمانو! تمھارا مقام یہ ہے کہ تم عاملِ قرآن بنو۔ اللہ و رسول کے سچے فرماں بردار رہو۔ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلو۔ اپنے سینہ میں ایمانی انوار اور اسلامی جذبات اور اللہ و رسول کی سچی محبت پیدا کرو۔ خوفِ الٰہی اور صبر و توکل کی لازوال دولت سے اپنے سینوں کو مالا مال کرو۔ پیکرِ عمل بنو اور عمل میں اخلاص پیدا کرو۔ یعنی جو کام کرو اللہ و رسول کی خوشنودی کے لیے کرو۔ یہی تمھارا مقام ہے۔ اسی پر قائم رہنے میں تمھیں چین اور اطمینان ہے۔ عزت و شوکت ہے، سربلندی و سرفرازی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں حافظِ ملت کی سادہ نثر نگاری کے نادر نمونے بالکل واضح اور عیاں ہیں۔ ارشاد القرآن اور دیگر کتب و رسائل آپ کی سادہ نثر نگاری و پرکاری کی بہترین مثال ہیں۔

نثر مرصع: اردو ادب کے اقسامِ نثر میں "مرصع نثر" کو ایک نمایاں اور مقبول ترین مقام حاصل ہے۔ اردو کے ابتدائی ادوار میں یہ صنف بہت زیادہ مقبول و محبوب اور مروج رہی۔

نگارشات حافظِ ملت کے بیشتر حصے اگرچہ سادہ نثر کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن بعض مقامات پر "مرصع نثر" کا آفتاب بھی اپنی پوری توانائی اور تابانی کے ساتھ روشنی بکھیرتا اور قارئین کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ نثر مرصع کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

"گھٹائیں اٹھتی ہیں، بارشیں برستی ہیں، سیلاب آتے ہیں مگر پانی کا پانی ہی رہتا ہے۔ وہ ایک خاص ہی وقت ہوتا ہے جس میں بارانِ رحمت کا ایک قطرہ دہنِ صدف میں پہنچ کر گوہرِ آبدار بن جاتا ہے۔ (معارفِ حدیث، ص:۵۰، بزمِ عزیزی، بلرام پور)

سلاست و روانی: معیاری نثر کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ زبان و بیان کی صفائی و چاشنی کے ساتھ "سلاست و روانی" کا بہترین نمونہ ہو۔ اچھی نثر وہ ہے جو نظم کے مقابلے میں اپنا امتیازی رنگ اور انفرادی آہنگ قائم رکھ سکے۔ نثر کی کامیابی اور اس کی شیرینی و دل کشی کا راز اس کی سادگی، صفائی، سلاست، روانی اور بے ساختگی میں مضمر ہے۔ نثر جس قدر سلجھی ہوئی، مربوط، سادہ، رواں اور مضمون کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے، اسی قدر معیاری اور کامیاب سمجھی جاتی ہے۔

حافظِ ملت کی تحریر کا ایک اہم وصف "سلاست و روانی" ہے۔ سادہ، مربوط، رواں دواں اور سلاست و روانی کے زیور سے آراستہ نثر لکھنے میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ معارفِ حدیث، حافظِ ملت کی وہ بلند پایہ تصنیف ہے، جس میں آپ نے احادیثِ طیبہ کی توضیح و تشریح فرمائی ہے اور اس شان کے ساتھ کہ اس میں آپ کا محدثانہ جلال، محققانہ کمال، منطقیانہ طرزِ استدلال، فلسفیانہ پیرایۂ بیان اور ادیبانہ شان اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب کی حیثیت احادیثِ طیبہ کی توضیح و تشریح سے زیادہ ایک "ادبی جواہر پارے" کی ہے۔

عمدہ تحریر، معیاری ادب اور کامیاب نثر کی بہت ساری خصوصیات اس کتاب میں موجود ہیں۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے سر دست "سلاست و روانی" کی دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

نورِ ایمان سے جب مومن کا دل جگمگا اٹھتا ہے تو اس کا پاکیزہ اثر روحانیت پر اس درجہ پڑتا ہے کہ روح مرتبۂ کمال پر پہنچتی ہے۔ حیوانیت و درندگی دور اور لوازمِ بہیمیت کافور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انسان اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہو کر "انسانِ کامل" ہو جاتا ہے۔ اور اپنے خالق و مالک کو خوب پہچانتا ہے۔ اس کی اطاعت و عبادت میں لذت پاتا ہے، پیکرِ اخلاص بن جاتا ہے۔ جو کام کرتا ہے رضائے الٰہی اور خوشنودیِ خدا وندی ہی مقصود ہوتی ہے۔ زبان اور ہاتھ ہی کیا جسم کے تمام اعضا حکمِ الٰہی کے ماتحت ہی کارفرما رہتے ہیں۔ ہر حرکت و سکون خوشنودیِ معبود ہی کے لیے ہوتا ہے۔ (معارفِ حدیث، ص:۸)

یہ اقتباس جہاں "سلاست و روانی" کا بہترین نمونہ ہے، وہیں "سادگی و صفائی" کا نادر الوجود مرقع بھی ہے۔

انشائیہ نگاری: نثر میں سلاست و روانی کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے الفاظ و مضامین بہتے آبشار کے مانند ابلتے ہیں اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انشائیہ، ادب کی ایک چہیتی اور ہر دل عزیز صنف ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی (شاگرد سید سلیمان اشرف بہاری) کو انشائیہ نگاری میں مہارت اور ملکہ حاصل تھا۔ کسی بھی موضوع سے متعلق آزاد، شاداب اور فکر انگیز تحریر کا نام انشائیہ ہے۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ نے "معارفِ حدیث" میں مختلف دینی و اخلاقی موضوعات کے تحت بڑی شاداب اور فکر انگیز گفتگو فرمائی ہے۔ جس سے آپ کی تحریر میں سلاست و روانی کے ساتھ انشائیہ کی چاشنی اور دل کشی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اربابِ تحقیق و ادب کا کہنا ہے کہ انشائیہ میں افکار و خیالات خوشبو کی طرح پھوٹتے اور آبِ رواں کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ معارفِ حدیث اس کی زندہ مثال ہے، جہاں قارئین اسلامی افکار و خیالات کی خوشبو سے اپنے مشامِ جان و روح معطر کرتے ہیں اور پر شکوہ الفاظ و معانی کا نظارہ کر کے اپنی ادبی پیاس بجھاتے ہیں۔

سلاست و روانی کی دوسری مثال:

قرآن مجید ایک نظامِ محکم ہے۔ تمام طبقاتِ انسانی کے لیے کامل ہدایت ہے۔ بادشاہ و وزیر، غنی و فقیر سب کے لیے مکمل قانون ہے۔ عیش و عشرت کے لمحات ہوں یا کلفت و مصیبت کی گھڑیاں، خوف و ہراس کا وقت ہو یا اضطراب و بے چینی کا زمانہ، قرآن مجید ہر منزل میں مشعلِ راہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی کم نصیبی ہے کہ اس دولتِ لازوال سے محروم ہیں اور اس کی آغوشِ کرم چھوڑ کر پتھروں سے ٹکراتے اور در در مارے پھرتے ہیں۔ مسلمانو! آؤ، آؤ اور عقیدت و محبت کے ساتھ آؤ۔ بارگاہِ قرآنی میں حاضری دو، قرآن مجید ہی تمھارے درد کی دوا اور تمھارے دکھ کا علاج ہے۔ (ارشاد القرآن، ص:۹)

تصانیفِ حافظِ ملت میں سلاست و روانی کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ بخوفِ طوالت انھیں دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علمی نثر: جلالۃ العلم حضور حافظِ ملت علیہ الرحمۃ جامع معقولات و منقولات تھے۔ درسِ نظامی کے مروجہ علوم و فنون میں ملکۂ راسخہ اور مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "استاذ العلما" اور "جلالۃ العلم" جیسے پر شکوہ اور بھاری بھرکم الفاظ والقاب سے آپ یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کی تقریر بھی علمی ہوا کرتی اور تحریر بھی علوم و معارف اور حقائق و دقائق سے لبریز ہوا کرتی تھی۔

آپ کی تحریر کا سب سے ممتاز اور نمایاں ترین پہلو "علمی و استدلالی نثر" ہے۔ علمی نثر سے مراد وہ زبان و بیان ہے جس میں ہر طرح کے علمی مضامین ادا کیے جائیں۔

"الدیوبندیت" آپ کی وہ بلند پایہ اور معرکۃ الآرا کتاب ہے، جس نے خرمنِ وہابیت اور ایوانِ نجدیت و دیوبندیت میں آگ لگادی ہے۔

آپ کی علمی نثر کا نمونہ دیکھنا ہو تو "الدیوبندیت" کا مطالعہ کیجیے۔ العذاب الشدید بھی آپ کی "علمی نثر" کو اجاگر کرنے والا ایک اہم رسالہ ہے، جس کے بارے میں رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ: "میں نے العذاب الشدید سے مناظرہ سیکھا ہے۔"

ان دونوں کے علاوہ آپ کی علمی نثر کی جھلکیاں "فتاویٰ حافظِ ملت" میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ علوم و فنون اور حقائق و معارف کا سمندر اپنی تمام تر طغیانیوں کے ساتھ فتاویٰ حافظِ ملت میں رواں دواں ہیں۔

مولانا عبدالوحید مصباحی "فتاویٰ حافظِ ملت" کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

حضرت حافظِ ملت کے فتاویٰ میں کتاب و سنت سے استدلال، اقوالِ ائمہ اور مستند فقہا کی عبارتوں سے استناد، کلیات و جزئیات کا استحضار، تحریر کردہ مسئلہ میں مطلق و مقید مقامات کی تشریح و تعیین، جواب سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ، مصالح کی رعایت، رسمِ افتا پر کڑی نظر، تعصب و عناد پر مبنی سوالات کا مسکت و دنداں شکن جواب، جواب میں اختصار و جامعیت اور حسبِ ضرورت تشریح، یہ چند خوبیاں آپ کے فتاویٰ میں بہت نمایاں ہیں، جن کو پڑھنے والا محسوس و اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (ماہ نامہ اشرفیہ، ستمبر ۲۰۰۱ء، ص:۱۴)

استدلالی نثر: استدلالی نثر، علمی نثر کا ہی ایک روپ ہے۔ استدلالی نثر سے مراد یہ کہ جو دعویٰ کیا جائے، اسے دلیلوں سے ثابت کر دیا جائے۔ حافظِ ملت کی نثر علمی بھی ہے اور استدلالی بھی۔ الدیوبندیت، العذاب الشدید، انباء الغیب، جنتی فرقہ اور فتاویٰ حافظِ ملت، ہمارے دعویٰ کی دلیل ہیں۔

معارفِ حدیث سے "استدلالی نثر" کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ کریں:

"صراطِ مستقیم ایک ہی راستہ ہے اور وہی اہلِ سنت و جماعت ہے۔ عقلی طور پر صراطِ مستقیم ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے، اس لیے کہ مبدأ سے منتہا تک جتنے خطوط نکل سکتے ہیں، ان میں خطِ مستقیم (سیدھا) ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام خطوط منحنی (ٹیڑھے) ہی ہوں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ صراطِ مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام راستے کج اور ٹیڑھے ہی ہوں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی مقام اور جگہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دے کر ٹیڑھے راستوں سے بھی پہنچنا ممکن ہے، اگرچہ بُعدِ مسافت لازم، خطرات حائل، لیکن ٹیڑھا مذہب اختیار کر کے خدا تک پہنچنا کسی طرح ممکن نہیں۔ مذہب کو جگہ اور مقام پر قیاس کرنا ہرگز صحیح نہیں، یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اس لیے کہ راستے ٹیڑھے بھی سب اسی منتہیٰ اور مقام کے راستے ہیں اور وہاں تک پہنچاتے ہیں اور مذہب میں جو بھی ٹیڑھا راستہ ہے، وہ خدا کا راستہ ہی نہیں بلکہ وہ شیطان کا راستہ ہے۔ ہر ٹیڑھا راستہ شیطانی راستہ ہے، وہ شیطان تک پہنچاتا ہے۔ رحمٰن تک جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہی صراطِ مستقیم ہے۔" (معارفِ حدیث، ص:۱۴، ۱۵)

سادہ اسلوب: زبان کا بنیادی مقصد اظہارِ مدعا، ادائے مطلب اور افکار و خیالات کا ابلاغ و ترسیل ہے۔ ایک ادیب، قلم کار یا مصنف جب کوئی مضمون یا کتاب ترتیب دیتا ہے تو اس کے سامنے دو باتیں خاص طور سے توجہ طلب اور بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا لکھنا ہے؟ دوم یہ کہ کیسے لکھنا ہے؟ کیا لکھنا ہے؟ یہ مواد ہے اور کیسے لکھنا ہے؟ یہ اسلوب ہے۔ عناوین و موضوعات کے تنوع و اختلاف سے اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کی فرقت میں مضطرب اور بے چین ہے اور ایک محب اپنے محبوب کی

جدائی میں بے قرار اور مضمحل ہے۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ دونوں کی شدتِ غم، آہ وزاری اور نالہ وشیون میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ماں اور محبوب دونوں کی داستانِ الم و درد کو ایک اسلوب اور ایک پیرائے میں لکھنا یا بیان کرنا، ادبی نقطۂ نظر سے غیر مستحسن کام ہے۔ یہاں لا محالہ ادیب یا قلم کار کو "تبدیلیِ اسلوب" سے کام لینا پڑے گا۔ ورنہ ان کی تحریر پھیکی اور بے کیف مانی جائے گی۔

حافظِ ملت کی تحریرات و نگارشات میں جہاں "سادہ اسلوب" کا حسن نمایاں ہے، وہیں موقع ومحل کے پیشِ نظر "تبدیلیِ اسلوب" کا رنگ بھی بہت اچھوتا اور نرالا ہے۔ ہر موضوع اور عنوان کے تحت آپ کا اسلوب بھی بدلتا ہے۔ سادہ لوح عوام کے لیے آپ نے بڑا سادہ اسلوب اختیار کیا ہے اور اہلِ علم سے خطاب کرتے ہوئے علمی و استدلالی اور منطقیانہ وفلسفیانہ اسلوب سے کام لیا ہے۔

آپ کا ایک سادہ اسلوب "ارشاد القرآن" کا ہے اور ایک علمی و تحقیقی اسلوب "الدیوبندیت" اور العذاب الشدید" کا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ارشاد القرآن کے مخاطب سادہ لوح عوام ہیں اور الدیوبندیت اور العذاب الشدید میں دیوبندی ملّاؤں سے براہِ راست خطاب اور سوال وجواب ہے۔

معارفِ حدیث میں مختلف موضوعات سے متعلق احادیث کی توضیح وتشریح کرتے وقت آپ نے اسلوب بدل بدل کر کلام کیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے تمہید باندھنے کے بعد بڑے سادہ اور اچھوتے اسلوب میں آپ نے اسلامی عقائد ومعمولات اور دینی امور معاملات بیان کیے ہیں۔ اصل کتاب کی جانب رجوع کریں اور ہمارے دعویٰ کی تصدیق کریں۔

ماسبق میں آپ کی سادہ نثر نگاری پر روشنی ڈالی جاچکی ہے، اسی سے آپ کے سادہ اسلوبِ تحریر کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

تمثیلی اسلوب: نثرِ مرصّع، نثرِ مرجّز اور نثرِ عاری (نثرِ سادہ) اردو نثر کی عام روایتی قسمیں ہیں۔ ابلاغ واظہار اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے عام طور پر چار نثری اسالیب اردو میں رائج رہے ہیں، جنھیں مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۱) تمثیلی اسلوب (۲) مقفیٰ اسلوب (۳) داستانی اسلوب (۴) سادہ اسلوب۔

حافظِ ملت کی تحریر میں مقفیٰ اور داستانی اسلوب کا راقم کو علم و اندازہ نہیں ہوسکا۔ آپ کے سادہ اسلوب پر گفتگو ہوچکی ہے، اب آپ کے تمثیلی اسلوب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تمثیلی اسلوب سے مراد یہ ہے کہ تمثیلوں اور علامتوں کے ذریعہ مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ امور ومسائل بیان کیے جائیں۔

حافظِ ملت کی تحریر کا بنیادی مقصد مذہبیات و اخلاقیات یا بلفظِ دیگر اسلامیات ہے۔ اسلامی افکار و عقائد اور دینی امور و مسائل کی توضیح وتبلیغ ہی آپ کی تحریر وقلم کا ہدفِ اصلی ہے۔ کبھی علامت وتمثیل کے ذریعہ اور بسا اوقات سادگی و صفائی کے ساتھ آپ نے اپنی نگارشات کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ آپ کے تمثیلی اسلوب کا ایک جلوہ نذرِ قارئین ہے۔

"انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے، جب کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی مر گیا، تو بتاؤ جسم وروح میں سے وہ کون سی چیز ہے جو مرگئی یا فنا ہوگئی؟ کیا روح مرجاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اہلِ اسلام ہی نہیں بلکہ فلاسفر کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ روح نہیں مرتی۔ کیا جسم مرجاتا ہے؟ یہ بھی نہیں۔ اسے تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہو، ہاتھوں سے ٹٹولتے ہو، تمام اعضا اپنی جگہ سلامت ہیں۔ کوئی عضو فنا نہیں ہوا۔ پھر موت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں۔ موت جسم وروح کے اختلاف کا نام ہے۔ جب تک جسم وروح کا اتصال واتفاق تھا آدمی زندہ تھا۔ جب دونوں میں اختلاف وجدائی ہوگئی، کہہ دیا، انسان مرگیا۔ معلوم ہوا، اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت۔ ایک جسم و روح کا اختلاف شخص کی موت ہے، افرادِ خانہ کا اختلاف گھر کی موت ہے، ایک محلہ، ایک گاؤں، ایک شہر یا ایک ملک کا اختلاف، اس محلہ، گاؤں، شہر یا ملک کی موت ہے۔ (حافظِ ملت نمبر، ص:۱۸۴، ۱۸۵)

غرض کہ حافظِ ملت کی پچاس ساٹھ سالہ قدیم نثر آج بھی وہی کشش، جاذبیت اور ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سادگی، صفائی، سلاست وروانی، بے تکلفی وبے ساختگی، گنجلک اور مغلق اندازِ بیان کے بجائے مدعا نگاری، یہ تمام ادبی محاسن نگارشات حافظِ ملت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گویا حافظِ ملت کی نثر اس شعر کے مصداق ہے۔

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنیٰ شگفتہ، لفظ خوش، انداز صاف ہو

نظر فکر و

عالمی دہشت گردوں کو اسلحہ کی فراہمی

کیوں اور کیسے ؟

بزمِ دانش میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں ۔ ہم اربابِ قلم اور علمائے اسلام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں ۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں ۔ از: مبارک حسین مصباحی

اپریل ۲۰۱۶ء کا عنوان — فیس بک کے ذریعہ دعوت و تبلیغ: چند اہم تجاویز

مئی ۲۰۱۶ء کا عنوان — تفریحی مواقع اور ہماری اخلاقی قدریں

عالمی دہشت گرد تنظیم اسلحوں اور عسکری تربیت کے لیے امریکہ کی مرہونِ منت ہے

از: غلام رسول دھلوی۔ grdehlavi@gmail.com

جدید خوارج کی غیر اسلامی عسکری تنظیم داعش (دولت اسلامیہ عراق و شام) اسرائیل کے خلاف کچھ نہیں کرے گی کیونکہ وہ اسلحوں، اسباب نقل و حمل اور عسکری تربیت کے لیے امریکہ کی مرہون منت ہے اور اسرائیل امریکہ کا لے پالک ہے ۔ لہذا، اسرائیل پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب ہے امریکہ پر ہاتھ ڈالنا۔ اس لیے یہ امید کرنا کہ فلسطین کے مسئلے پر داعش کے خود ساختہ جہادی عناصر یا مسلم ممالک متحد ہو کر اقوام متحدہ اور یورپی ممالک کو اسرائیل کا ہاتھ روکنے پر مجبور کریں گے فضول ہے ۔ فلسطین نہ امریکہ کے لیے کسی کام کا ہے اور نہ عربوں کا کوئی مفاد اس سے وابستہ ہے ۔ عربوں اور مسلمانوں کا سارا مفاد عراق اور شام سے وابستہ ہے اس لیے ان کی تمام تر دلچسپیاں انہیں دو ملکوں میں اسلام کے تحفظ سے متعلق ہیں ۔

آج کل عراق میں نام نہاد اسلامی خلافت کے بڑے چرچے ہیں ۔ ان کے جہادی پورے عراق میں اسلامی خلافت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں ۔ شام کی جنگ میں بھی اسلامی ملکوں کی دلچسپی دیدنی ہے جہاں حکومت مخالف بغاوت کو شیعہ سنی جنگ کا رنگ دے کر اسلامی ممالک اس خانہ جنگی میں دامے درمے سخنے تعاون دینے کے لیے تیار ہیں ۔ ان ممالک کے شیعہ اور سنی علماء بھی اپنے فتاوی کے ذریعے سے اسے کفر اور اسلام کی جنگ قرار دینے میں پیچھے نہیں ہیں ۔ عراق اور شام میں لڑنے والے جنگجوؤں کے لیے جہادی حسیناوں کا انتظام کرنے کے لیے انہوں نے فتاویٰ تک جاری کر دیے ۔ عراق میں بھی کامیابی کے پرچم لہرانے والے داعش کو مبینہ طور پر عرب ممالک نے رقم مہیا کی تو امریکہ نے تربیت دی ۔ مگر جب فلسطین کو اسرائیل کے ظلم سے نجات دینے کا معاملہ آیا تو عرب اور اسلامی ملکوں پر مردنی چھا گئی ، ان کا سارا ذوق جہاد جس کے لیے وہ عراق اور شام کے نوجوانوں کو اکسا رہے تھے سرد پڑ گیا۔ ان کی قومی حمیت اور اسلامی غیرت مردہ ہو گئی اور انہوں نے معصوم اور نہتھے فلسطینیوں کو اسرائیلی ٹینکوں اور راکٹوں کا سامنا پتھروں سے کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔

گذشتہ کئی روز سے اسرائیل نے فلسطین کی غزہ پٹی پر ہوائی حملے کئے ہیں جن کے نتیجے میں سو سے زیادہ معصوم فلسطینی شہری بشمول بچے ہلاک ہوئے ہیں اور چھ سو سے زائد افراد زخمی ہوئے ہیں ۔ مارچ سے اسرائیل نے اس خطے میں اپنی جارحانہ کارروائیاں جاری رکھی

ہیں۔ پہلے اس نے شام پر حملے کیے جس کے لیے اس نے ایک سولہ سالہ بچے کے گولان پہاڑیوں پر بم یا مورٹار حملے میں فوت ہونے کو عذر بنایا۔ گولان پہاڑیوں پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ کی عرب۔اسرائیل جنگ میں قبضہ کیا تھا۔ یہ علاقہ اسرائیل اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔ لہذا شام میں جاری شامی فوج اور باغیوں کے درمیان لڑائی کے دوران راکٹ وغیرہ اسرائیلی سرحد کے پار غیر ارادی طور پر آجاتے ہیں۔ لہٰذا، ایسے ہی کسی بم یا راکٹ کے گرنے سے ایک اسرائیلی عرب نوجوان ہلاک ہوگیا اور اس کا باپ اس میں زخمی ہوگیا۔ اس کے جواب میں اسرائیل نے شام کے فوجی ٹھکانوں پر حملے کئے۔

اسرائیل کے جاری حملوں میں غزہ پٹی میں آہوں اور کراہوں کا شور ہے۔ ہر مکیں کسی بھی ناگہانی حملے کے خوف سے لرزیدہ ہے۔ مکانات ملبوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ رمضان کے مبارک ماہ میں فلسطین کے مسلمانوں پر اسرائیل کی طرف سے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ معصوم بچے، عورتیں، ضعیف افراد، غرض کہ کوئی بھی اسرائیل کی سنگدلانہ کارروائیوں سے بچا ہوا نہیں ہے۔

اس سارے سانحے کا سب سے غم آگیں پہلو یہ ہے کہ تمام عالم اسلام اسرائیلی بربریت پر خاموش ہے۔ دنیا کے یہ ۵۷ اسلامی ممالک مالی اور فوجی اعتبار سے اسرائیل سے کسی بھی طرح سے کم نہیں ہیں اور اگر یہ ۵۷ ممالک اسرائیل کے خلاف کھڑے ہوجائیں تو فلسطین کا معاملہ ایک دن میں حل ہوجائے مگر چونکہ یہ سارے ممالک امریکہ کے غلام ہیں اور کچھ مسلکی اختلافات نے بھی انہیں ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہونے میں مانع ہے اس لیے وہ فلسطین کے مسئلے پر متحد نہیں ہوسکتے۔

۵۷ اسلامی ملکوں پر مشتمل آرگنائزیشن آف اسلامک کو آپریشن (او آئی سی) نے میٹنگ کرنے اور اسرائیل کی مذمت کرنے اور اقوام متحدہ سے اسرائیل کی جارحیت کو روکنے کی اپیل کے سوائے اور کچھ نہیں کیا ہے۔ متحدہ عرب امارات نے ۲۵ ملین ڈالر کی امداد فلسطینیوں کو دے کر اخلاقی حمیت کا ثبوت دیا ہے مگر فلسطینیوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی ہنگامی میٹنگ میں سکریٹری جنرل بان کی مون نے اسرائیل اور حمس کے درمیان جاری تصادم میں ہونے والی ہلاکتوں پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ امریکی صدر اوبامہ نے بھی دونوں طرف سے جنگ بندی کرانے کی کوشش شروع کردی ہے۔ مگر اس کے لیے انہوں نے فلسطینیوں سے کہا ہے کہ وہ پہلے اسرائیل پر راکٹ سے حملہ کرنا بند کردیں۔ ادھر حماس نے کہا ہے کہ یہ جنگ اسرائیل نے شروع کیا ہے مگر اسے روکنا اس کے ہاتھ میں نہیں ہے اور وہ اسے سبق سکھا کر رہیں گے۔ اسرائیل کے وزیر اعظم نے بھی اشارہ دیا ہے کہ وقت پڑا تو وہ زمینی حملہ بھی شروع کردیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو مزید فلسطینی مارے جائیں گے اور تباہی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا۔

او آئی سی اس سلسلے میں قابل ذکر کردار ادا کرسکتی تھی مگر اسلامی ممالک کی سرد مہری نہ صرف افسوس ناک ہے بلکہ مردہ دلی کی آخری حد ہے۔ او آئی سی میں ۵۷ ممالک ہیں جن میں ۶۵ ممالک اقوام متحدہ کے ممبر بھی ہیں۔ ان اسلامی ممالک میں پاکستان جیسا نیوکلر ملک بھی ہے اور ایران جیسا طاقتور ملک بھی جو نیوکلیائی ہتھیار بنانے کے قریب ہے۔ سابق ایرانی صدر اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کی دھمکی دیتے رہے مگر جب بھی عملی طور پر اسے جواب دینے کی نوبت آتی ہے تو وہ خاموش ہوجاتا ہے۔ ☆☆☆

.....

مولانا محمد عابد چشتی، استاد جامعہ صمدیہ، پپھوند شریف۔

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جب بھی دہشت گردی کے مسائل زیر بحث آتے ہیں تو غیر ارادی طور پر یہ سوال دماغ کے کینوس پر بار بار ابھر کر آتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ دہشت گرد جو سر عام کشت وخون کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں اور دن کے اجالے میں ہزاروں معصوم لوگوں کو پوری سفاکی، بے دردی اور بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں دنیا کے سینکڑوں ملک اور سپر پاور طاقتیں ان مٹھی بھر دہشت گردوں کو نیست و نابود کرنے یا ان پر شکنجہ کسنے میں ناکام ہیں؟ نیز عالمی برادری کی جوابی کارروائیوں کے باوجود آخر دہشت

گردی کا دائرہ سمٹنے کے بجائے کیوں بڑھ رہا ہے ؟ ؟اور القاعدہ ، الشباب ، بوکوحرام ، طالبان ، جیش محمد ، اور داعش جیسی انتہا پسند تنظیمیں پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپناوجود قائم رکھنے میں کیسے کامیاب ہیں ؟؟؟

ان سارے سوالات کا دو ٹوک جواب یہ ہے کہ عالمی سطح پر دہشت گردی کا فروغ ان منافق صفت طاقتوں کی دین ہے جو دنیا کے سامنے بیان تو کچھ دیتے ہیں مگر کام اپنی متعیّنہ پالسی کے مطابق ہی کرتے ہیں مثلاً:

انتہا پسند تنظیموں کی بربریت کا سارا دارومدار انتہائی مھلک اور جدید ترین ہتھیاروں پر ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اکثر جہادی تنظیمیں ہتھیاروں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع رکھتی ہیں کہ اگران تک ہتھیار کی فراہمی کے سارے ذرائع بند کر دیے جائیں تب بھی یہ تنظیمیں دو سے لیکر تین سال تک مسلسل مورچہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ اس قدر وافر مقدار میں اسلحہ کی فراہمی ان جہادی تنظیموں کے لیے جن پر عالمی برادری کی کڑی نظر رہتی ہے کس طرح ہوتی ہے ؟تجزیہ کاروں نے اس سلسلہ میں دو طرح کے نظریات پیش کیے ہیں پہلا نظریہ تو یہ ہے کہ یہ جہادی تنظیمیں مختلف ذرائع سے جمع کردہ اپنے فنڈ سے اسلحہ کی خرید و فروخت کرتی ہیں اور دوسرا نظریہ ہے کہ جن ممالک کو ان جہادی تنظیموں کے ذریعہ اپنے خصوصی مفادات اور اغراض پورے ہوتے یا پورے ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں وہ اسلحہ اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے ذریعہ ان انتہا پسندوں کا در پردہ تعاون کرتے ہیں اور دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے بیان یہی دیتے ہیں کہ " ہم دہشت گردی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے "

سر دست ہم عالمی دہشت گردوں کی سب سے نمایاں تحریک داعش کی اسلحہ جاتی سرگرمیوں کو لیکر بات کرتے ہیں جس کے تناظر میں عالمی دہشت گردوں کی دیگر تنظیموں کے متعلق رائے قائم کرنا آسان ہوگا۔

داعش یعنی " الدولۃ الاسلامیہ فی العراق و الشام " اس وقت عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہ تنظیم اب تک کی سب سے خونخوار اور سفاک دہشت گرد تنظیم کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی ہے جو جدید ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہے۔ یہ تنظیم ہتھیار خریدتی بھی ہے اور در پردہ کئی طاقتیں بطور امداد بھی اسلحہ کی بھاری مقدار انہیں پہنچا رہی ہیں ۔ اس وقت عراق اور شام میں تیل کے گیارہ بڑے ذخائر داعش کے قبضے میں ہیں جس کے ذریعہ ایک اندازہ کے مطابق روزانہ تین ملین پیسہ انہیں حاصل ہوتا ہے اب یہ تیل خریدتا کون ہے ؟ تو اس سلسلہ میں دہشت گردی کے خلاف لڑائی کے ضمن میں مالیاتی جاسوسی سے وابستہ امریکہ کے نائب وزیر برائے مالیات " ڈیوڈ کوہن " ایک بیان میں کہتے ہیں :

" ہم تک جو اطلاعات پہنچی ہیں ان کے مطابق داعش مختلف دلال کمپنیوں کو تیل بہت کم قیمت میں فروخت کرتی ہے "

کمپنیوں کے ہاتھوں تیل کے بڑے ذخائر کی کھپت کے ذریعہ داعش کروڑوں روپیہ کمارہی ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ یہ کمپنیاں کسی نہ کسی ملک سے تعلق رکھتی ہوں گی اب کیا بعید ہے کہ انہیں کمپنیوں سے داعش تک اسلحہ پہنچ رہا ہو جو داعش سے تیل خرید رہی ہیں۔

عالمی معاملات پر گہری نظر رکھنے والے کچھ مفکرین کا ماننا یہ ہے کہ داعش کے پاس اسلحہ کی فراوانی ان ملکوں کی مرہون منت ہے جو شام اور عراق کی حکومت کو تہ و بالا کر کے وہاں اپنے اقتدار یا اس کے علاوہ دیگر مفادات کے خواب دیکھ رہے ہیں جس میں بہت سے گلف ممالک کے ملوث ہونے کا شبہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ مگر خود عراقی عوام اور اپنے گھروں سے دور پناہ گزینوں کا عندیہ یہ ہے کہ امریکہ جو اس وقت امن عالم کا سب سے بڑا ٹھیکیدار ہے وہی داعش کو نہ صرف ہتھیار بلکہ اشیائے خورد و نوش تک فراہم کر رہا ہے چنانچہ ایک عراقی پناہ گزیں انگریز صحافی " yarosla trofimove " کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہتا ہے:

we all know that america is providing isis with wepons and food

" ہم سب جانتے ہیں کہ امریکہ ہی آئی ایس آئی ایس کو ہتھیار اور کھانا تک فراہم کر رہا ہے "

ایک دوسرا پناہ گزیں کہتا ہے:

we now think isis is being used as a tool by America to divide and weaken Iraq

اب ہم سمجھ چکے ہیں کہ داعش امریکہ کے ذریعہ بطور آلہ استعمال کی جارہی ہے صرف عراق کو پارہ پارہ اور کمزور کرنے کے لیے "

بات سمجھنے کی بھی ہے کہ اگر کوئی بھی ملک دہشت گردوں کا

ساتھ نہیں دے رہا ہے جیسا کہ سب کا دعویٰ یہی ہے اور ساری دنیا دہشت گردی کے خلاف صف آرا ہے تو ان عالمی دہشت گردوں کو اسلحہ کون فراہم کر رہا ہے ؟اور ان دہشت گردوں کے پاس جدید ہتھیار کہاں سے آیے نیز اس کے علاوہ خوراک ، ادویات اور دوسری اہم چیزیں جن کے بغیر ایک تربیت یافتہ فوج بھی نہیں لڑ سکتی آخر یہ چیزیں اس قدر وافر مقدار میں ان کے یہاں کیسے مہیا ہیں ؟؟ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تسلیم شدہ ملک جب سرکشی کرتا ہے اور عالمی برادریاں اس کی سرکشی روکنے کے لیے صرف اقتصادی پابندیاں عائد کرتی ہیں تو اس ملک کے حکمراں اور عوام چند ہی مہینوں میں چیخ پڑتے ہیں اور آخر کار انہیں عالمی برادری کے سامنے جھکنا پڑتا ہے مگر یہ معاملہ بڑا حیران کن ہے کہ وہی عالمی برادری پورے جوش و جذبہ کے ساتھ دہشت گردوں کے خلاف کھڑی ہوئی ہے مگر دہشت گرد ذرہ برابر پریشان ہونے کے بجایے ساری دنیا کی نیندیں حرام کیے ہویے ہیں اور یہی چیز امریکہ اور ان جیسی منافق طاقتوں کی پشت پناہی اور درپردہ تعاون کی غمازی کر رہی ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان خود ساختہ جہادی تنظیموں کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی دہشت گردوں تک اسلحہ کی فراہمی بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریقوں سے ہو رہی ہے کوئی تیل خرید کر ان دہشت گردوں کے اسلحہ اندوزی کی راہ آسان کر رہا ہے اور کوئی یوں ہی اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے براہ راست اسلحہ فراہم کر رہا ہے اور یوں عالمی دہشت گردی اپنے آقاؤں کی سرپرستی میں خوب پھل پھول رہی ہے ۔ اب رہی یہ بات کہ اسلحہ کی فراہمی کیوں کی جا رہی ہے یعنی اس کے پیچھے کس طرح کے عزائم کار فرما ہیں یا ہو سکتے ہیں تو ہم اس اہداف کو تین جہتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں سیاسی ۔ اقتصادی اور مذہبی۔

سیاسی اهداف:۔کچھ ممالک اپنا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے داعش کو ہر طرح کا تعاون پیش کر رہے ہیں اور نہ صرف داعش بلکہ جہاں کہیں بھی یہ نام نہاد جہادی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں خواہ وہ جہاد کے نام پر" الشباب اور بوکو حرام " ہوں یا اپنے حقوق کی بازیابی کے نام پر" نکسل واد" ہوں ان سب کے فروغ اور بقا کے پیچھے کہیں نہ کہیں لوگوں کی سیاست جڑی ہوتی ہے اور جب تک ایسے سیاست پرست اور تکریم انسانیت کے جذبہ سے خالی لوگ رہیں گے اس وقت تک نہ مقامی، علاقائی اور ملکی دہشت گردی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی عالمی دہشت گردی کا۔

اقتصادی اهداف:۔عالمی دہشت گردوں کو اسلحہ کی فراہمی میں ایک مناسب حد تک اقتصادی مقاصد کا بھی دخل ہے جس میں وہ ممالک ملوث ہیں جن کے اقتصادیات کا بڑا حصہ اسلحہ سازی پر موقوف ہے ۔یہ ممالک ایسے مواقع کا بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنے اسلحوں کا کاروبار کرتے ہیں تاکہ اقتصادی اور معاشی اعتبار سے وہ مضبوط و مستحکم رہیں اگرچہ اس کی وجہ سے لاکھوں بچے بے سایہ، ہزاروں لوگ بے گھر اور انسانوں کی ایک آبادی خاک و خون میں نہا جائے۔

مذهبی اهداف:۔اسلام اور عالم اسلام ہمیشہ سے دشمنوں کی زد پر رہا ہے اور اسلام کو بدنام کرنے اور عالم اسلام کو کمزور کرنے کے لیے یہودی لابی مسلسل لگی ہوئی ہے تاکہ مغربی ممالک میں اسلام کے بڑھتے قدموں کو روکا جائے ۔اس کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں میں اسلام کے تعلق سے بدگمانی ، نفرت اور غم و غصہ پیدا کیا جائے اور اس کام کے لیے دہشت گردی سے بہتر اور کوئی طریقہ نتائج نہیں دے سکتا ہے لہذا اسے درپردہ فروغ دیا جا رہا ہے اور یہی اسلام دشمن عناصر جی بھر کید ہشت گردوں کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں تاکہ دہشت گردی کی آگ بجھنے نہ پائے جس کی لپٹوں میں اکثر مسلم ممالک اور مسلم عوام جھلس رہے ہیں۔ جبکہ اسرائیل جیسا اسلام کا کھلا دشمن ملک ابھی تک داعش کے حملوں سے پاک ہے میرے خیال سے اگر داعش کے اس رویہ کی تہ تک پہنچا جائے تو دہشت گردی کے تعلق سے کئی چونکا دینے والے حقائق سامنے آسکتے ہیں۔

مذکورہ گفتگو کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دہشت گردوں پر حملے کرنے کے بجایے اگر واقعی دنیا کی بڑی طاقتیں یا اقوام متحدہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنا چاہتی ہیں تو انہیں سب سے پہلے ان ممالک کی ناک میں نکیل کسنا چاہیے جو ان دہشت گردوں کو براہ راست یا بالواسطہ اسلحہ اور دیگر سامان مہیا کر رہے ہیں۔ دہشت گردی خود ہی دم توڑ دے گی۔☆☆☆

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں
مولانا ہارون رشید مصباحی
عزیزی کتاب گھر، بڑھریا، ضلع سیوان (بہار)
9955020974

ممبئ عظمیٰ کی مختصر تاریخ

توفیق احسن برکاتی کا تاریخ ساز تحقیقی کارنامہ

ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

مفتی محمد توفیق احسنؔ برکاتی مصباحی نوجوان سنی علما میں کئی اعتبار سے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ بیک وقت ایک جواں سال زود گو نثر نگار، مایہ ناز ادیب، بلند پایہ شاعر، محقق عالم دین، بے لوث معلم اور بہترین مفتی ہیں۔ آپ کی ولادت بہنگواں، اعلاپور، ضلع اعظم گڑھ کے ایک علم دوست گھرانے میں ۱۲ر جولائی ۱۹۸۴ء کو ہوئی۔ مقامی مدرسہ حنفیہ انوارالعلوم اور جامعہ عربیہ اظہارالعلوم، جہاں گیر گنج، فیض آباد میں ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم ہوئی۔ اعلا دینی تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ اشرفیہ عربی یونی ورسٹی مبارک پور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے عالمیت و فضیلت کے ساتھ تحقیق فی الفقہ کا کورس مکمل کیا۔ فی الحال آپ ممبئ کی مشہور دانش گاہ الجامعۃ الغوثیہ میں تدریسی خدمات پر مامور ہیں، ساتھ ہی ساتھ ماہ نامہ سنی دعوتِ اسلامی، ممبئ کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ آپ کا موے قلم زمانہ طالب علمی ہی سے نثر و نظم دونوں میدانوں میں گل بوٹے کھلا رہا ہے۔ اتنی کم عمری میں آپ نے دنیاے سنیت کو کئی بیش بہا کتب و رسائل کا تحفہ پیش کیا ہے۔ لیکن جس انداز سے اس جواں سال قلم کار کی پذیرائی ہونی چاہیے وہ نہ ہو سکی۔ بہ ہر کیف! آپ کا تحقیقی، تصنیفی اور تالیفی سفر تیز رفتاری سے جاری و ساری ہے۔ ہند و پاک کے مختلف ماہ ناموں اور اخبارات میں آپ کے تحقیقی مقالات اور کتب و رسائل پر تبصرے مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر آپ کی تاریخ ساز تحقیقی تصنیف ''ممبئ عظمیٰ کی مختصر تاریخ'' سجی ہوئی ہے۔ جو صحیح معنوں میں عروس البلاد ممبئ میں سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت کی مذہبی سرگرمیوں کی اولین تاریخی دستاویز کہلانے کا جملہ حقوق اپنے نام محفوظ رکھتی ہے۔ موصوف نے ممبئ کی عمومی تاریخ کو ''موہن جوداڑو'' اور ''ہڑپا'' کی کھدائی کی مثل ممبئ میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی مذہبی سرگرمیوں کی خصوصی تاریخ کے گم شدہ و گم گشتہ جزائر کو ''واسکوڈی گاما'' کی طرح تلاش کرنے کی کامیاب محققانہ کوشش کی ہے اور اسے بڑی صاف ستھری، رواں دواں، دل نشین اور شستہ علمی و ادبی زبان میں خوانِ مطالعہ پر سجا دیا ہے۔ اس اہم ترین تحقیقی کتاب کی تصنیف پر راقم برادرِ گرامی محبِ مکرم مفتی توفیق احسن برکاتی کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اتنی اہم کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد بھی ہمارے اس مایہ ناز محقق کی جس انداز سے ستایش اور پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ہماری جماعت کا بہت بڑا المیہ ہے۔ پیشہ ور مقررین پر ہم روپے پانی کی طرح بہا دیتے ہیں جب کہ برسوں شب و روز محنت شاقہ کے بعد اس طرح کے تحقیقی کام کرنے والوں کو حوصلہ افزائی کے دو لفظ بولنے میں بھی ہم بخیلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

توفیق احسنؔ برکاتی کی یہ تحقیقی تصنیف کسی پی ایچ ڈی مقالے سے کم نہیں۔ بلکہ فی زمانہ لکھے جانے والے سطحی انداز کے پی ایچ ڈی مقالات کی بھیڑ میں یہ تحقیقی کتاب کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ ۴۶۴ر صفحات پر پھیلی ہوئی ''ممبئ عظمیٰ کی مختصر تاریخ'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں فاضل مصنف نے تحقیق کے جدید ترین اصولوں کی مکمل طور پر پاسداری کی ہے۔

باب اول میں صوبہ مہاراشٹر کے حدودِ اربعہ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا ہے اور شہر ممبئ کے قدیم و جدید رنگ کو نمایاں کیا ہے۔ مہاراشٹر کا جغرافیہ اور محل وقوع اور ممبئ از ابتدا تا انتہا کے تاریخی پس منظر کو بڑی عرق ریزی سے پیش کیا ہے۔ ۹ر صفحات پر مبنی اس مختصر سے باب میں ممبئ شہر کی جغرافیائی، سماجی، تعلیمی، مذہبی، معاشی اور سیاسی تاریخ کا اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

باب دوم میں ہندستان میں اسلام کے دورِ اول کو عنوان بنایا ہے جو کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس باب میں فاضل محقق نے کافی گہرائی و گیرائی سے اپنے موقف کو بیان کیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے مصنف کی دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا وصف صاف جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ قدیم و جدید مآخذ کی روشنی میں ظہورِ اسلام سے ہندستان میں اسلام کی آمد تک اور ہندستان میں مسلمانوں کی قدیم

mushahidrazvi79@gmail.com

اور اولین آبادی کی تحقیق میں مصنف کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ اس باب کے مطالعہ سے ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے متعلق تاریخ کے بہت سے گم شدہ جواہر پارے ہمارے ہاتھ لگتے ہیں۔

باب سوم میں قطبِ کوکن فقیہ مخدوم علی مہائمی علیہ الرحمہ کے احوال و آثار، دینی و علمی خدمات اور اس عہد کے مذہبی و سیاسی حالات کو قلم بند کیا ہے۔ ممبئی کی تاریخ قطب کوکن حضرت فقیہ مخدوم علی مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکرِ خیر کے بغیر کسی بھی صورت میں مکمل تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ممبئی شہر دراصل ان ہی بے نفس اور خدادوست شخصیت کی دعاؤں کا ثمرہ ہے جو ہمارے ملک بھارت کی صنعتی راجدھانی کا درجہ رکھتا ہے۔ توفیق احسن برکاتی نے اس باب میں قطب کوکن فقیہ مخدوم علی مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ آپ کی علمی و دینی اور عظیم روحانی شخصیت کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی تصانیف عقائد و نظریات، خدمات اور روحانیت وغیرہ کا بیان اجمال میں تفصیل کا جلوہ لیے ہوئے ہے۔ حضرت قطبِ کوکن کے عہد کے مذہبی حالات کو بیان کرتے ہوئے فاضل محقق نے اُس زمانے کے مسلمانوں میں رائج بعض معمولات کو مستند و معتبر حوالوں سے مزین کرکے بیان کیا ہے، جو دورِ حاضر میں کچھ "مہربانوں" کے نزدیک "بدعت" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان چشم کشا حقائق میں سے صرف ایک مثال نشانِ خاطر کریں۔ توفیق احسن برکاتی نے حضرت مخدوم علی مہائمی علیہ الرحمہ کے عہد میں عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جشن کے انوکھے انداز کو مولانا ابوظفر حسان ندوی (بھیونڈی) کی زبانی یوں کوڈ کیا ہے:

"مولانا ابوظفر ندوی اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عید ولادت کا جشن بھی پایہ تخت گجرات میں خوب دھوم دھام سے منایا جاتا، پہلی ربیع الاول سے صبح و شام نعت خوانی ہوتی، جس میں سادات، ائمہ مساجد، مشائخ، صوفیہ، زہاد، عباد، صلحا، فقرا اور عوام سب شریک ہوتے، شاید ہی کوئی معزز اور مشہور آدمی اس کی شرکت سے محروم رہ جاتا۔ یہ اجتماع بارہ ربیع الاول تک جاری رہتا، اس میں نعت خوانی کے ساتھ قرآن خوانی، حدیث خوانی، ذکر اور آواز کے ساتھ درود خوانی بھی ہوتی، بارہویں کی شب کو آخری مجلس میلاد میں نعت خوانی ہوتی۔ اور جب ولادت کا ذکر قریب آتا تو سلطان بھی پہنچ جاتا، پھر خلعت لایا جاتا، جس میں سلے، بن سلے کپڑے ہوتے اور ترتیب کے ساتھ میلاد خوانوں کو، پھر مخصوص لوگوں کو، پھر عام لوگوں کو دیا جاتا، کوئی وہاں سے محروم واپس نہ آتا۔" (ممبئی عظمیٰ کی مختصر تاریخ ص: ۶۳۔ بہ حوالہ: گجرات کی تمدنی تاریخ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ایڈیشن ۲۰۰۵ء، ص: ۱۳۰)

باب چہارم میں شہر ممبئی کے مسلم دورِ حکومت اور مذہبی احوال و آثار کا تجزیہ کرتے ہوئے آغاز میں لکھتے ہیں: "ممبئی پر مسلمانوں کا دورِ حکومت زیادہ واضح نہیں ہے، اس وجہ سے ممبئی کے مذہبی حالات بھی پردہ خفا میں ہیں۔ البتہ مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے قبل ممبئی اور ماہم میں وہ مسلمان عرب آباد تھے جو تجارتی اغراض کی بنا پر یہاں آئے تھے اور مقامی باشندوں میں خلط ملط ہو چکے تھے۔ ہم ذیل میں تاریخ کی چند کڑیاں ملا کر اس حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" (ص: ۶۹)

تاریخ کے بکھرے اوراق سے توفیق احسن برکاتی نے بڑے تحقیق و تفحص سے حُسن ترتیب کے ساتھ اس باب میں تاریخ کی کڑیوں کو ملاتے ہوئے کامیاب نتیجہ اخذ کیا ہے۔ چوں کہ یہ تحقیقی کتاب ممبئی عظمیٰ میں سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت کی مذہبی سرگرمیوں کو محیط ہے لہٰذا اس باب میں جابجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ ممبئی دورِ قدیم ہی سے اہل سنت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے عوام و خواص پرانے زمانے سے ہی ان ہی مراسم اور معمولات کو انجام دیتے آئے جنھیں آج عرفِ عام میں "بریلوی معمولات" سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ حقائق اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی ولادت سے قبل ہی سے ممبئی تو کجا پورے ملک میں ایسے معمولات رائج تھے۔ اس باب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے سفرِ ممبئی کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ آل انڈیا سنی کانفرنس جیسی اہل سنت و جماعت کی متحرک اور فعال تنظیم میں شامل ممبئی کے علما کے ذکر سے بھی اس باب کو سجایا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ممبئی کے مذہبی حالات کا تاریخی و تحقیقی تجزیہ کرتے ہوئے فاضل محقق نے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی ممبئی کے مسلمانوں کے وہی عقائد و معمولات تھے جنھیں آج ایک مخصوص مذہبی فکر کا حامل طبقہ "بدعت" کہتے نہیں تھکتا۔ انگریزوں کی سازشوں سے مذہبی فرقہ بندی کے سبب کس طرح ممبئی کے مسلمانوں کے عقائد میں بگاڑ آنا شروع ہوا اور بد مذہبیت کے علمبرداروں نے کس طرح اہل سنت کی مساجد پر قبضہ جمایا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس وقت بدمذہبوں نے اپنا سازشی جال بچھانا شروع کیا۔ بہ ظاہر خود کو کمزور ظاہر کرکے در پردہ اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند سنی مساجد پر اپنا سیاسی رسوخ استعمال

کرتے ہوئے قبضہ بھی جمالیااور چند نئی مساجد خود تعمیر کیں۔"(ص:۹۴)

اس مقام پر اگر بد مذہبوں کے ذریعے قبضے میں لی گئی مساجد کا نام بھی درج کر دیا جاتا تو بات دو آتشہ ہو جاتی۔ ممبئی میں سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت کے تحفظ و استحکام میں علمائے اہل سنت کی خدمات کو بھی اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجم کو ممبئی شہر میں آرام فرما اولیائے کرام و بزرگانِ دین کے تذکرہ خیر سے آراستہ و مزین کیا گیا ہے۔ جزیرہ ممبئی دورِ قدیم ہی سے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کی آماجگاہ رہا ہے۔ جگہ جگہ مزارات و مقابر اولیا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ عقیدے و عقیدت میں رچی بسی ممبئی کے عوام ان پاکانِ خدا کے آستانوں پر بڑے ادب و احترام سے حاضر ہوتے ہیں جس میں مذہب اور رنگ و نسل کی کوئی تفریق دیکھنے کو نہیں ملتی۔ تیسرے باب میں قطب کوکن مخدوم علی مہائی رحمۃ اللہ علیہ کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے اس باب میں حضرت علی شاہ بخاری، شیخ مصری، بابا حاجی عبدالرحمٰن شاہ قادری، بسم اللہ شاہ بابا، سید عبداللہ شاہ قادری، سید مقبول شاہ قادری، بابا بہاء الدین قادری اصفہانی، سید عاشق شاہ بخاری، سید بدرالدین رفاعی، سید عبداللہ شاہ، سید مظفر شاہ علیہم الرحمہ کا ذکرِ جمیل موجود ہے۔ ان اولیائے کاملین کے علاوہ بھی ممبئی کی خاک پر آرام فرما مزید اولیا کے تذکار مواد کی عدم فراہمی کے سبب اس کتاب کی زینت نہ بن سکے۔ بہ قول مصنف: "جو مواد کی عدم فراہمی کی وجہ سے تشنہ تشنہ سا ہے اور کئی بافیض اولیا کا تذکرہ رہ گیا ہے۔" مزید کریدنے انداز میں اہل تحقیق کو دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ویسے اولیائے ممبئی پر ایک مستقل کتاب کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے، اے کاش! کوئی قلم کار اس جانب توجہ دے اور یہ تاریخ اس کے نام منسوب ہو جائے۔"(ص:۱۲)

باب ششم میں عروس البلاد کے وفات یافتہ علمائے اہل سنت اور سرکردہ مشائخ کے احوال پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کا مستقل قیام تو اس شہر میں نہیں رہتا تھا لیکن ان کی قربانیوں کا گہرا نقش اس شہر نے قبول کیا ہے۔ ان علما و مشائخ میں علامہ شاہ فضل رسول بدایونی، مولانا سید محمد ابراہیم بلگظہ، قاضی سید عبدالفتاح گلشن آبادی، مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی، مولانا نذیر احمد خجندی صدیقی، مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، شیر بیشہ سنت علامہ حشمت علی لکھنوی، سید آلِ مصطفیٰ قادری مارہروی، سید مصطفی حیدر حسن میاں مارہروی، مفتی محبوب علی رضوی لکھنوی، سید حامد اشرف کچھوچھوی، علامہ مشتاق احمد نظامی، سید انوار اشرف مثنیٰ میاں، آلِ رسول سید حسنین میاں نظمی مارہروی، مولانا عبدالقادر کھتری، مولانا غلام ربانی فائق، مولانا عبدالرحیم ساحل مصباحی، مفتی شعبان علی نعیمی حبابیاور مولانا منصور علی رضوی علیہم الرحمۃ والرضوان قابلِ ذکر ہیں۔ مصنف نے ان علما و مشائخ کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کو بالتفصیل قلم بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ۱۳۵/ صفحات پر پھیلے ہوئے اس اہم باب میں کچھ متقدمین و متاخرین علما کا تذکرہ نہ ہو سکا۔ اس ضمن میں توفیق احسن برکاتی کا حق پسند قلم اس طرح اعتراف کرتا ہے جو یقیناً فاضل محقق کے اپنی تحقیق کے تئیں مخلصانہ رویوں کی غمازی کرتا ہے: "متقدمین و متاخرین میں چند علما چھوٹ بھی گئے ہیں۔" چند سطروں کے بعد ان علما کے نام شمار کرتے ہوئے راقم ہیں کہ: "ان حضرات پر مواد کی تحقیق جاری ہے، ان شاء اللہ بہت جلد اس کی تکمیل کی کوشش ہوگی۔"(ص:۱۳)

باب ہفتم میں ممبئی کی سنی تحریکات کی تاریخ اور ان کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے آل انڈیا جماعت رضائے مصطفی، انجمن تبلیغ صداقت، بزم قادری رضوی، آل انڈیا سنی جمعیۃ العلماء، آل انڈیا جمعیۃ الاشرف، آل انڈیا تبلیغ سیرت، آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت، رضا اکیڈمی ممبئی، دعوتِ اسلامی ممبئی، اور سنی دعوتِ اسلامی ممبئی جیسی ممبئی عظمیٰ میں ماضی و حال میں سرگرم و متحرک اور فعال تنظیموں کا تفصیل کے ساتھ تحقیقی منظر نامہ توفیق احسن برکاتی کے قلم زر نگار نے غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

باب ہشتم میں مصنف نے ممبئی عظمیٰ میں جاری موجودہ مدارس اہل سنت کے احوال و کوائف کو درج کیا ہے۔ یوں تو ممبئی کے مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے سیکڑوں مدارس و مکاتب اہل سنت جاری و ساری ہیں۔ اس باب میں ۲۸/ نمایاں مدارسِ دینیہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

باب نہم میں فاضل محقق نے سنی صحافت کو موضوع بنایا ہے، اور قدیم و جدید اخباری و مجلاتی صحافت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مسلمانوں کے قدیم مطابع کا بھی ذکر کیا ہے۔ ممبئی کے ابتدائی اخبارات کا سرسری بیان کرتے ہوئے ضمنی عنوان "صحافت اور ادب" پر مختصر مگر جامع بحث کی ہے جو مصنف کے صحافتی مزاج کی بھی عکاسی کرتی ہے اور ساتھ ہی صحافت اور ادب پر ان کے دقتِ نظر کا اظہاریہ بھی ہے۔ "بر صغیر کی مطبوعہ صحافت کا عہدِ اولین" عنوان کے تحت مصنف نے سیر حاصل تحقیقی مواد سپردِ قرطاس کرتے ہوئے ممبئی کی صحافتی تاریخ کا ہلکا سا اشاریہ بھی پیش کیا ہے۔ بہ قول مصنف: "ہندوستانی زبان میں مطبوعہ صحافت کی

مذکورہ تفصیلات میں غور کرنے سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر ہندوپاک میں آزادی سے قبل کے صحافتی نقوش میں سرزمین بمبئی کے اہم ترین اخبارات و جرائد اعلیٰ ترین چمک دمک رکھتے ہیں اور ان کا صحافتی سفر اعلیٰ ترین قدروں کا حامل ہے۔"(ص:۳۴۲)

اس باب میں مصنف نے صحافت، ادب اور مطبوعہ صحافت کے بعد سنی صحافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص ۱۹۴۷ء کے بعد سنی صحافت پر کافی گفتگو کی ہے۔ اور کثیر تعداد میں سنی اخبارات و رسائل کے اسماشمار کرائے ہیں۔ آزادی کے بعد مسلم سنی مذہبی صحافت میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اب تو ایک نئے رنگ و آہنگ سے سنی صحافت اپنا جلوہ بکھیر رہی ہے۔ بہ قول مصنف: "آزادی کے بعد سے اب تک کے سنی رسائل و جرائد پر نظر ڈالی جائے تو بڑا خوش آیند نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں کو سنی صحافت کا عہدِ زریں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"
(ص:۳۴۵)

توفیق احسن برکاتی کے قلم نے اس باب میں بعض ان اخبارات پر تحقیقی انداز میں تنقید کے نشتر بھی چلائے ہیں جو کہ خالص غیر مذہبی ہونے کے باوجود بھی اہل سنت مخالف سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔ ۶۵ صفحات پر مشتمل یہ باب ۳۲ سنی مذہبی اخبارات و رسائل اور جرائد کا تفصیلی معلوماتی اشاریہ ہے۔ بعض اہم اخبارات و رسائل پر معروف اہل علم و قلم کے تاثرات کو بھی حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ نیز اہل سنت و جماعت کی ترویج و اشاعت اور ردِ بدمذہباں میں ان اخبارات و رسائل کی خدمات کو صاف ستھری علمی زبان میں خوانِ مطالعہ پر سجانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ سنی صحافت پر مبنی یہ باب خود مصنف کے نزدیک بھی سنی صحافت کی نامکمل تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔ کسی مصنف و محقق کا اس طرح کھلے دل سے اعتراف کرنا اور اپنی بات یا تحقیق کو حرفِ آخر نہ سمجھنا توفیق احسن برکاتی کے علمی قد کو مزید بلند و بالا کرتا ہے۔

باب دہم میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے ممبئی میں خدمات انجام دینے والے سنی طباعتی و نشریاتی اداروں کا تعارف اور ان کی مطبوعات کا ذکر کیا ہے۔ ۵۷ صفحات پر مشتمل اس باب میں ۳۳ طباعتی و نشریاتی اداروں کا تعارف ہمیں حاصل ہوجاتا ہے۔

اخیر میں کتابیات کا گوشہ شامل ہے جس میں ۷۷ قدیم و جدید کتب اور ۴۰/ اخبارات و رسائل کے نام درج ہیں جن سے مصنف نے استفادہ اٹھایا ہے۔ ۱۱۷/ کتب و رسائل اور اخبارات کے حوالوں سے مزین و آراستہ مفتی توفیق احسن برکاتی کی یہ تاریخ ساز علمی و تحقیقی دستاویز ممبئ عظمیٰ کی اہل سنت کی تاریخ کا اولین پڑاؤ ہے، جو ہر اعتبار سے لائق تحسین و ستایش ہے۔ اس تحقیقی کام میں مصنف کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے کہیں بھی کسی بھی شخصیت، تنظیم، مدارس، اخبارات، رسائل اور نشریاتی اداروں کا ذکر کرنے میں ذاتی وابستگی اور عقیدت و محبت کو حاوی نہیں ہونے دیا اور جن اخبارات و رسائل وغیرہ کے اہل سنت مخالف رویوں پر تنقید کی ہے اس میں بھی کہیں اصول تنقید سے سرِ مو انحراف نہیں کیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں محقق کو کیسی محنت و مشقت کرنی پڑی ہوگی، اس کو تحقیق جیسے دقت طلب میدان میں سفر کرنے والے ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ "ممبئ عظمیٰ کی مختصر تاریخ" کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اسے یوں ہی نہیں لکھ دیا بلکہ اس کے لیے انھیں بڑی پاپڑ ماری کرنا پڑی ہے۔ جب کہ یہ کام کوئی منصوبہ بند پروجیکٹ کا حصہ نہ ہونے کے باوجود بھی منصوبہ بند لگتا ہے۔ بہ قول مصنف: "یہ موضوع نہ کسی منصوبہ بند پروجیکٹ کا حصہ ہے اور نہ ہی فیلوشپ کے تحت تحریر کیا گیا ہے، بلکہ محض ایک اہم ضرورت کے شدید احساس اور ذاتی دل چسپی کا نتیجہ ہے۔" (ص:۱۱) اور اس عرق ریزی میں انھیں کیسی دقتیں اٹھانا پڑیں اس کا بھی ہلکا اشارہ یوں کرتے ہیں: "نئ ممبئ میں امامت و خطابت، ممبئ میں تدریس اور میگزین کی ادارت کے بعد جو وقت ملتا رہا، اس میں یہ کام ہوتا رہا۔ لائبریریوں میں جانا، ممبئ کے بزرگ علما و ائمہ سے ملاقات و مکالمہ، خانقاہوں اور مدارس کے ذمہ داران سے رابطہ کرکے معلومات کا نوٹس تیار کرنا ایک دشوار گزار کام تھا، کہیں ہمت افزائی تو کہیں حوصلہ شکنی اور تلخیوں بھری باتیں، سب کچھ سہتا رہا اور جمع کرتا رہا، اب یہ کل جمع پونجی قارئین کے حوالے کر رہا ہوں۔" (ص:۱۲)

بے پناہ مصروفیات کے باوجود حوصلہ افزائی اور دل شکنی، محبت اور تلخیوں کے ملے جلے اثرات کے سائے میں پیش کی گئی یہ تحقیقی کاوش بھرپور پذیرائی اور استقبال کی مستحق ہے۔ اخیر میں ایک بار پھر میں مفتی توفیق احسن برکاتی کو اس اہم تحقیقی اور تاریخی دستاویز پر ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ کریم اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ و طفیل ان کی جملہ خدمات کو شرفِ قبول بخشے، انھیں صحت و سلامتی عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں سرخرو کرے۔

(آمین بجاہِ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم)

نقد و نظر

نام کتاب:	تجلیاتِ نوری (مجموعہ مضامین)
موضوع :	مولانا شاکر علی نوری، امیر سنی دعوت اسلامی
مرتب :	مولانا سید امین القادری
صفحات	448 قیمت: 100 روپے
ناشر:	**سنی دعوت** ،مکتبہ طیبہ، کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی
مبصر:	عطاء الرحمٰن نوری (جرنلسٹ)

سوادِ اعظم اہل سنّت و جماعت کی عالمگیر تحریک سنّی دعوت اسلامی کے امیر داعی کبیر حضرت مولانا حافظ و قاری محمد شاکر علی نوری مدظلہ العالی گزشتہ پچیس سالوں سے اپنے رفقاے کار کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر دین و سنیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۳،۱۲،۱۱/ دسمبر ۲۰۱۵ء کو سنّی دعوت اسلامی کے عالمی سالانہ سنّی اجتماع کا انعقاد وادیِ نورآزاد میدان ممبئی میں عمل میں آیا۔ جس میں کئی کتابیں منظر عام پر آئیں ۔ دنیا میں پہلی بار امیر تحریک کی حیات و خدمات پر مضامین کا ایک حسین گلدستہ بنام ''تجلیات نوری'' کا اجرا مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی کے ہاتھوں عمل میں آیا جسے مالیگاؤں کے نگراں آل رسول حضرت مولانا الحاج سید محمد امین القادری نے مرتب کیا ہے ۔'' تجلیات نوری '' چار ابواب تاثرات ، مقالات، مشاہدات اور منظومات پر مشتمل ہے ۔ تاثرات کے باب میں عالم اسلام کے ۴۰/ جید و مستند علماے کرام کے تاثرات شامل ہیں جب کہ مقالات میں ملک و بیرون ملک کے ۴۳/ نامور قلمکاروں کے مقالے شامل ہیں ۔ ان مقالوں میں امیر تحریک کے خاندانی پس منظر، احوال و آثار ، دینی و علمی خدمات اور تصانیف کا گراں قدر تعارف و تذکرہ موجود ہے ۔ مشاہدات میں ۷/ ثقہ راویوں نے اپنے مشاہدات کو سپرد قلم کیا ہے ،اس طرح یہ کتاب ایک مکمل سوانحی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔۵/ منظوم کلام بھی کتاب کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں، تحریک پر لکھے گئے ۲/ ترانوں کو بھی منظومات میں جگہ دی گئی ہے اور کتاب کے آخر میں تحریک کا مکمل تعارف اور مکمل شعبہ جات کی تفصیل تحریر کی گئی ہے ۔ کتاب اور اس میں موجود نگارشات دستاویزی رنگ اختیار کر گئے ہیں جو بہت بڑا کمال ہے ۔ چاروں ابواب انتہائی وقیع اور بے حد قیمتی ہے ،اس کا اندازہ مضامین کے تفصیلی مطالعے کے بعد لگایا جا سکتا ہے ، وقت کی انتہائی معتبر شخصیات اور ماہر ارباب قلم کی شمولیت بھی اس کتاب کی وقعت میں اضافے کا سبب بن رہی ہے ۔ یہ ایک انقلابی نوعیت کا تحقیقی کارنامہ ہے جس کی روشنی میں حقائق کا تعین پہلے سے زیادہ آسان اور ممکن ہو گیا ہے ۔ یہ ایک تاریخی کام ہے جس کی پہلی بار طباعت کا سہرا شاخ مالیگاؤں کو جاتا ہے ۔ جس میں مرتب کی محنتیں اور ان کے قلم کی رنگ آمیزیاں قارئین کو تحسین و آفریں پر آمادہ کرتی ہیں ۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی زبان و قلم میں پختگی، علم و عمل میں برکت اور فکر و خیال میں وسعت عطا فرمائے ۔ (آمین) ۴۸۵/ صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت ۱۰۰/ روپے زیادہ نہیں ہے ۔ ہم اتنی قیمتی ، حقائق سے مملو اور خیال انگیز کتاب کی ترتیب پر مصنف کو مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔ پوری کتاب حوالہ جات، مشاہدات، حقائق اور تاریخی قرائن سے بھری ہوئی ہے اور یہ رنگ ثقاہت پیدا کرتا ہے اس لیے آج کے دور میں اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے ۔ کتاب کا کاغذ نہایت عمدہ اور نفیس استعمال کیا گیا ہے ۔ مرکز سنی دعوت اسلامی، مالیگاؤں، مکتبۂ طیبہ، کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی اور دیگر مکتبوں سے کتاب کو حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں

باڑمیر راجستھان میں
محمد ہاشم/لعل محمد
جیلانی یونانی اسٹور، سروار
باڑمیر، راجستھان

جھارکھنڈ میں
مولانا محمد جسیم الدین صاحب
مقام و پوسٹ کس کو، ضلع لوہردگا (جھارکھنڈ)

پرتاپ گڑھ میں
مخدوم ملت لائبریری
مقام و مقاٹ سیف آباد، ضلع پرتاپ گڑھ (یوپی)

منظومات

نعت پاک

چارہ گر حیران ہے اللہ یہ کیا ہو گیا
ذکرِ طیبہ کر دیا، بیمار اچھا ہو گیا
پست ہو کر رہ گئے بیمارِ غم کے حوصلے
شاہِ طیبہ کے کرم سے پار بیڑا ہو گیا
اب طبیبوں کی دواؤں کی مجھے حاجت نہیں
خاکِ طیبہ ہی سے ہر دکھ کا مداوا ہو گیا
روضۂ اطہر کو سجدہ ہوش میں ممکن نہ تھا
بے خودی میں دوستو کعبے کا دھوکا ہو گیا
غازۂ رُخسار جس نے خاکِ طیبہ کو کیا
ماہِ طیبہ سے بھی روشن اُس کا چہرا ہو گیا
ہو گئی آباد جس کے دل میں یادِ مصطفیٰ
مومنوں کا قبلۂ جاں، دل اُسی کا ہو گیا
اب فرشتوں کی زبانوں پر بھی اس کا نام ہے
جب سے صابرؔ مصطفیٰ کا نام لیوا ہو گیا

رباعیات بیادِ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ

تھی حافِظِ ملت کی وہ نکتہ رَس ذات — صائب تھی ہر اک بات تو سنجیدہ بات
کیوں ہوتے ہیں بلوے، یہ دیا اس کا جواب — "لیڈر ہیں سبب اِس کا، یا پھر اخبارات"

وہ حق کی حمایت میں رہے سینہ سپر — لوہا لیا باطل سے سدا ہوکے نڈر
تھے غازیِ دیں حافظِ ملت صابرؔ — اللہ تعالیٰ کی ہو رحمت اِن پر

قصبے میں تھا اک چھوٹا سا مکتب گم نام — اعلیٰ ہے مگر ملک میں اب اس کا مقام
اب حافظِ ملت کو نہ بھولے گا جہاں — اس مردِ مجاہد نے کیا ہے وہ کام

اُس حافظِ ملت پہ خدا کا انعام — جس نے دیا انساں کو یہ اعلیٰ پیغام
آباد ہے جب تک تو، زمیں پر کر کام — جب زیرِ زمیں جائے تو کرنا آرام

جس جس نے اِسے جانا ، کہا بیت العلم — اللہ تعالیٰ کی عطا، بیت العلم
دے حافظِ ملت کو خدا اس کی جزا — اک چھوٹا سا مکتب تھا، ہوا بیت العلم

ڈاکٹر صابر سنبھلی

منقبت درشان حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان

آقا کا دیوانہ بنایا حضرت حافظِ ملت نے — مرجھائی کلیوں کو کھلایا حضرت حافظ ملت نے
جس کے علم و فضل کی کرنیں پھیل رہی ہیں عالم میں — ایسا اک قندیل جلایا حضرت حافظِ ملت نے
کام زمیں کے اوپر کرنا نیچے کر لینا آرام — پیار سے یہ سب کو سمجھایا حضرت حافظ ملت نے
حد درجہ ہے جس نے بڑھائی اپنے بزرگوں کی توقیر — فاسق باطل کو نہ لگایا حضرت حافظِ ملت نے
شیر و شکر بن کر رہتے تھے جو اپنے ہم عصروں میں — سب سے محبت کر کے دکھایا حضرت حافظِ ملت نے
اپنے اپنے وقت کا عالم فاضل بن کے چمکا ہے — ایک سبق جس کو بھی پڑھایا حضرت حافظِ ملت نے
رد میں منافق کے لکھ کر کے عشق و محبت کی وہ کتاب — نجدی کی بنیاد ہلایا حضرت حافظ ملت نے
اشرفیہؔ کے بچوں سے جو خوب محبت کرتے تھے — روتے ہوؤں کو پَل میں ہنسایا حضرت حافظِ ملت نے
یوں تو روضے پر اب نعمتؔ جاتا رہتا ہے اکثر
خواب ہی میں پہلے بُلوایا حضرت حافظِ ملت نے

پھول محمد نعمت رضوی، مظفر پور

سفرِ آخرت

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی کا سانحۂ ارتحال

ولادت: ۱۹۳۸ء - وصال: ۴؍فروری ۲۰۱۶ء

مبارک حسین مصباحی

صد قابلِ افسوس خبر ہے۔ حضرت علامہ غلام رسول سعیدی کا ۲۴؍ربیع الآخر ۱۴۳۷ھ/۴؍فروری ۲۰۱۶ء بروز جمعرات وصالِ پر ملال ہو گیا۔ ہم بھی اللہ ہی کے ہیں اور بلا شبہہ ہمیں اسی کی جانب پلٹ کر جانا ہے۔ آپ کا سانحۂ ارتحال جہان اہلِ سنت کا انتہائی الم ناک حادثہ ہے۔ آپ کے ایصالِ ثواب کے لیے کثیر مقامات پر ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی عزیز المساجد میں حضرت مولانا قاری محمد رضا مصباحی نے نمازِ جمعہ سے قبل ان کے لیے ایصالِ ثواب کیا۔ ۵؍فروری ۲۰۱۶ء کو نمازِ جمعہ کے بعد ۴؍بجے پاکستان کے معرف عالمِ دین حضرت مفتی منیب الرحمٰن نے نمازِ جنازہ کی امامت فرمائی اور بصد حسرت و یاس اس اعظم عالمِ ربانی کو سپردِ خاک کیا گیا۔

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ ایک عام انسان تھے۔ آہستہ آہستہ زندگی میں صالح انقلاب آیا، تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزر کر آپ نے تدریسی میدان میں قدم رکھا، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت کثیر ہے۔ آپ علوم و فنون میں اپنی مثال تھے۔ تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر اور تحقیق و تدقیق میں یکتاے راز گار تھے۔ آپ ایک بلند پایہ واعظ تھے، آپ کے مواعظِ حسنہ آج بھی سامعین کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ آپ عظیم ترین قلم کار تھے، آپ کی تحریروں میں دلائل و شواہد کے انبار ہوتے ہیں۔ آپ نے درجنوں جدید مسائل کے حل نوٹ فرمائے اور اگر کبھی فکری طے شدہ مسئلہ میں کوئی دوسری تحقیق سامنے آتی تو آپ رجوع کرنے میں بھی گریز نہیں فرماتے۔ اس قسم کے مسائل کی بھی ایک فہرست ہے۔ آپ مناظروں میں بھی ہمیشہ کامیاب رہتے اور مدِ مقابل کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ آپ کی تحقیق و تحریر میں بلند پایہ رسوخ پایا جاتا ہے، جب آپ کسی جدید مسئلہ پر اپنی بحث نوٹ فرماتے ہیں تو تحقیقات کے دریا بہا دیتے ہیں۔ آپ زہد و تقویٰ میں بھی بلند مقام رکھتے تھے، عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور محبت اولیاے کرام میں بھی بڑی انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا مقام عہدِ حاضر میں بڑی خوبیوں کا حامل تھا، بلند پایہ اوصاف و امتیازات کے باوجود عجز و انکسار کے پیکر تھے، تکبر و غرور سے دور رہتے تھے۔ اخلاق کریمانہ ان کے فکر و عمل میں نمایاں نظر آتے تھے، چلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے، سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پابند تھے، تضیع اوقات سے ہمیشہ پرہیز فرماتے تھے، وہ اپنی خوبیوں کا دل کش مرقع تھے، ان کا وجود عہدِ حاضر میں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت تھی، فروعی مسائل میں اختلافات ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ آپ نے بھی اختلافات کیے ہیں، مگر وہ ہر محقق کے دلائل کو توجہ سے سنتے تھے۔ ضد و ہٹ دھرمی ان کے یہاں نہیں تھی، دوسرے محققین کی باتوں سے اگر آپ مطمئن ہو جاتے تو تسلیم فرما لیتے اور اگر مطمئن نہیں ہوتے تو اپنے دلائل کی روشنی میں اپنے مدعا پر قائم رہتے تھے۔

ولادت اور ابتدائی احوال: حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ دہلی کے ایک معزز اور دولت مند خاندان میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے، وہیں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کے ہنگامہ خیز حالات سامنے آئے اور دہلی کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہونے لگی تو بڑی تعداد میں دہلی وغیرہ کے مسلمانوں نے نئے ملک پاکستان کی جانب کوچ کرنا شروع کر دیا۔ انھی دنوں آپ کا خاندان بھی دہلی سے کراچی منتقل ہو گیا۔ کراچی میں آپ نے نویں جماعت تک تعلیم جاری رکھی۔ اس کے بعد ایک پریس میں ملازمت شروع کر دی۔ علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کے والد اور بڑے بھائی غیر مقلد تھے، دینی معلومات نہ ہونے کے باوجود علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کے دل میں عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چنگاریاں تھیں۔ اگر کہیں سے صلاۃ و سلام کی آواز آتی تو آپ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور جب تک آواز آتی رہتی آپ کھڑے رہتے۔

ملازمت کے دوران ۱۹۵۶ء میں آپ کو قانونی طور پر نمازِ جمعہ ادا کرنے کا وقت ملنے لگا۔ آپ جس مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے جاتے، اس میں سنی امام تھے۔ اس کے بعد آپ آرام باغ کراچی کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جانے لگے۔ حسنِ اتفاق کہ وہاں

اہلِ سنت کے عظیم داعی اور مناظر حضرت مولانا محمد عمر اچھروی علیہ الرحمۃ کے خطابات سننے کا موقع ملنے لگا۔ ان کی تقریروں میں محبت الٰہی اور عشقِ مصطفوی کا سوز و گداز تھا۔ اختلافی مسائل پر دلائل و شواہد کی کثرت ہوتی تھی۔ اس ماحول نے آپ کو علمِ دین کے حصول کی جانب مائل کیا۔ پہلے آپ تلاوتِ قرآن عظیم اور ترجمۂ قرآن مجید کی جانب مائل ہوئے۔ مگر افسوس گھر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ تھا۔ آپ کو حضرت مولانا محمد عمر اچھروی کے عشق انگیز خطابات سے جو لطف ملتا تھا وہ اس ترجمے میں مفقود تھا۔ ایک جانب عظمتِ مصطفیٰ اور علمِ غیبِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دل کش جلوے تھے، جب کہ اس ترجمے میں یہ ساری چیزیں ناپید تھیں۔ اس قسم کے تضادات نے آپ کو اندر سے باہر تک ہلا کر رکھ دیا۔ اب آپ نے باضابطہ دینی علوم حاصل کرنے کا عزم کر لیا، انھی دنوں جامعہ محمدیہ رضویہ رحیم یار خاں کے سالانہ اجلاس کے اشتہار پر نظر پڑی، اس میں طالبانِ علومِ نبویہ کو علمِ دین حاصل کرنے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ آپ پہلی فرصت میں جامعہ پہنچ کر ایک طالب علم کی حیثیت سے داخل ہو گئے۔

حضرت علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ فرماتے تھے۔

"میں نے درس نظامی کے تمام مروجہ علوم پڑھے، حدیث و تفسیر اور اجلہ علما کی تصنیفات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا لیکن نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علمِ غیب شریف کے انکار کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی۔"

حضرت علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ نے ڈیڑھ سال تک ایک طالب علم کی حیثیت سے اس ادارے میں گزارے، بطور خاص فاضل گرامی حضرت مولانا حافظ عبد المجید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں استفادہ کیا۔ اسی دوران جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے شیخ الحدیث غزالیِ زماں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، اسی نسبت سے آپ "سعیدی" لکھتے ہیں۔ اس کے بعد آپ جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو، لاہور تشریف لائے، حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی علیہ الرحمۃ سے قطبی، شرح جامی اور جلالین شریف وغیرہ کتابیں پڑھیں، تلخیص المفتاح کے چند اسباق حضرت علامہ مفتی عزیر احمد بدایونی علیہ الرحمۃ سے پڑھے۔ اس دوران آپ نے دار العلوم امدادیہ مظہریہ، بندیال شریف، ضلع خوشاب کی بہت زیادہ تعریفیں سنیں، اس ادارے کے شیخ الحدیث ملک المدرسین حضرت علامہ عطا محمد چشتی نور اللہ مرقدہ تھے۔ ان کی درس گاہ سے استفادہ کرنے کی ہوک اٹھی اور پھر آپ وہاں بھی پہنچ گئے۔ اس دار العلوم کے مالی حالات اس وقت کمزور تھے، مگر تعلیمی احوال حضرت شیخ الحدیث کی وجہ سے بڑے مضبوط تھے۔ جس وقت آپ وہاں پہنچے حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری علیہ الرحمۃ بھی زیرِ تعلیم تھے۔ حضرت علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ کے تعلق سے حضرت علامہ شرف قادری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔

"ان دنوں راقم الحروف بھی بندیال شریف میں زیرِ تعلیم تھا۔ ان دنوں یہ طریقہ تھا کہ دوپہر کے وقت ایک ایک روٹی فی کس ملتی تھی (وہ روٹی خاصی بڑی ہوتی تھی) جسے طلبہ دوپہر کے وقت لسّی کے ساتھ کھاتے تھے، لیکن سعیدی صاحب کے لیے لسّی مضر تھی، اس لیے اکثر و بیش تر لقمہ منھ میں ڈال کر اوپر سے پانی کے گھونٹ پی لیتے اور اس طرح پوری روٹی کھا لیتے اور کبھی کبھار چار پیسے کا گڑ لے لیتے اور اس سے روٹی کھا لیتے (در اصل ان دنوں بندیال شریف کی آمدن کچھ اتنی نہ تھی کہ طلبہ کا انتظام بہترین بنایا جا سکے، اب بفضلہٖ تعالیٰ پہلے کی نسبت بہت بہتر انتظام ہے۔)" [شرح صحیح مسلم، ج:۱، ص:ر، المجمع المصباحی، مبارک پور]

تین ساڑھے تین سال تک بندیال شریف میں رہے، وہاں آپ نے معقول و منقول کی آخری کتب مثلاً قاضی مبارک، حمد اللہ، شمس بازغہ، صدرا، خیالی، ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، ترمذی وغیرہ کتب پڑھیں، تصریح اقلیدس استاذ العلما حضرت مولانا ولی النبی سے اور سراجی حضرت مولانا مختار احمد سے جامعہ قادریہ رضویہ لائل پور میں پڑھی۔ اس طرح بڑی محنت سے مروجہ علوم و فنون کی تکمیل فرمائی۔

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"یہ غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے جب میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عطا محمد بندیالوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پڑھنے کے لیے بندیال گیا ہوا تھا۔ وہاں میں حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری رحمہ اللہ سے متعارف ہوا اور ان کا ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ کیوں کہ ہم دونوں کے مزاج اور ذہنی رجحانات بہت زیادہ ملتے جلتے تھے، اس لیے بہت جلد ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔"

مزید لکھتے ہیں:

"(حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری) اس ناکارہ فقیر کو بھی مہمیز لگاتے رہتے تھے اور کہتے تھے، اگر آپ یوں نہیں لکھیں گے تو میں آپ کو رائلٹی دے کر لکھواؤں گا۔ وہ نہ جانے کتنے علماے اہلِ سنت کی کاوشوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کر گئے۔ آج ایسے لوگ کہاں؟ اب ایسا مسلک کا درد رکھنے والا مجسم عمل کہاں سے لائیں۔"

(الشرف، شرفِ ملت نمبر، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص:۱۱۴، ۱۱۵)

تدریسی اور تبلیغی خدمات: فراغت کے بعد آپ ۱۹۶۶ء کی ابتدا میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں مدرس مقرر ہوئے۔ عرصہ دراز کے بعد آپ دار العلوم نعیمیہ کراچی چلے گئے۔ وہاں زندگی کے آخری لمحات تک آپ شیخ الحدیث رہے۔

حضرت علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ بلند پایہ محدث و مفسر اور یکتائے روزگار استاذ تھے، آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی کثیر ہے۔ آپ ایک عظیم واعظ اور مناظر بھی تھے، زہد و پارسائی، علم و تقویٰ آپ کی زندگی کے لازمے تھے۔ صداقت و دیانت آپ کی حیات کے درخشاں نقوش تھے، انھی اوصاف و کمالات نے آپ کو عام طور پر عوام و خواص میں مقبول ترین منزل پر فائز کیا تھا۔ آپ کے خطابات میں بازاری مقرروں جیسا رنگ ڈھنگ نہیں تھا، بلکہ علوم و فنون کا بحر زخار ہوتا تھا، وہ جس موضوع پر بھی خطاب فرماتے تھے، موضوع کا حق ادا فرمادیا کرتے تھے، آپ نے متعدّد بار کامیاب مناظرے بھی فرمائے۔ ۱۹۶۶ء میں حلقہ گڑھی شاہو میں ایک وہابی نے محفل میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے انعقاد پر سخت الفاظ میں تنقید کی اور بات مناظرے تک پہنچ گئی۔ اہلِ سنت کے مناظر علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ منتخب ہوئے۔ فریق مخالف کے مناظر مولوی عبد القادر روپڑی مقرر ہوئے، وہابی مناظر نے کہا کہ اگر میلاد شریف اچھا کام ہوتا تو حضور ضرور کرتے، اس کا مطلب ہے کہ میلاد شریف اچھا کام نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

"قرآن کریم کو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یکجا مصحف میں جمع نہیں فرمایا۔ تمھارے قول کے مطابق یہ کام اچھا نہ ہوا، حالاں کہ شیخین کریمین حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ کام انجام دیا تھا، اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ حضرات شیخین کریمین نے اچھا کام نہیں کیا، یہ صحابۂ کرام کی توہین و بے ادبی ہے، لہٰذا اس بات کو واپس لو۔ اس سخت گرفت پر روپڑی صاحب نے بھرے مجمع میں قرآن مجید اٹھا کر انکار کر دیا کہ میں نے یہ بات نہیں کی۔ اس طرح انھیں بھری مجلس میں شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔"

دوسری بار ۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء کو محلہ توحید گنج لاہور میں روپڑی صاحب سے "علمِ غیبِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" پر مناظرہ ہوا۔ آپ نے "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" کے تحت مشہور غیر مقلد نواب صدیق حسن بھوپالی کی عبارت تفسیر فتح البیان سے پیش کی۔ روپڑی صاحب لاجواب ہو کر بھاگ گئے اور آپ کو یہ دوسری کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی طرح آپ نے اور بھی کامیاب مناظرے فرمائے۔

تصانیف و تحقیقات:

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمۃ دیگر علوم و فنون کے ساتھ بلند پایہ محقق تھے آپ کی تحریروں میں علمی مباحث کی کثرت ہوتی ہے، آپ نے زندگی میں ہزاروں صفحات لکھے، ان کا اندازِ نگارش یہ تھا: پہلے قرآن مجید سے استدلال فرماتے، اس کے بعد احادیث، آثار اور اقوالِ تابعین نوٹ فرماتے پھر ائمہ اربعہ کے اقوال نوٹ فرماتے اس کے بعد فقہ حنفی پر مفصل بحث فرماتے اور اس کی ترجیح کے دلائل رقم فرماتے۔ جدید مسائل میں آپ کی تحقیقات صدیوں تک محققین کے لیے مراجع کی حیثیت سے باقی رہیں گی، ذیل میں ہم چند کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) توضیح البیان لخزائن العرفان: مشہور دیوبندی عالم محمد سرفراز خان صفدر گکھڑوی نے صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کی تفسیر خزائن العرفان پر تیرہ اعتراضات کیے تھے۔ علامہ سعیدی علیہ الرحمۃ نے ہر اعتراض کے جواب میں ایک مفصل باب لکھا، یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان سے متعدّد مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے شائع ہونے کے چودہ سال بعد شیخ سرفراز گکھڑوی نے اس کے ایک باب کا جواب "اتمام البرہان" کے نام سے لکھا۔ علامہ صاحب نے "مقامِ ولایت و نبوت" کے نام سے اس کا جواب لکھ دیا، جو متعدّد بار شائع ہو چکا ہے۔

(۲) ذکر بالجہر: بلند آواز سے ذکر کرنے کے جواز اور استحسان کے متعلق آپ نے "ذکر بالجہر" لکھی۔ شیخ گکھڑوی نے اس کے جواب میں "اخفاء الذکر" لکھی۔ آپ نے اس کے جواب میں "ذکر بالجہر" کا دوسرا حصہ لکھا۔ یہ دونوں حصے متعدّد بار شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) تذکرۃ المحدثین: اس کتاب میں ائمۂ اربعہ اور صحاحِ ستہ کے مولفین اور ان کی تالیفات کا مفصل تذکرہ ہے، یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان سے مسلسل شائع ہو رہی ہے۔

(۴) تاریخ نجد و حجاز: مکہ اور مدینہ میں محمد بن عبد الوہاب نجدی کے تسلط کی مفصل تاریخ ہے، بعض وجوہ سے علامہ صاحب نے یہ کتاب مفتی محمد عبد القیوم قادری کے نام سے شائع کرادی تھی۔ مولانا محمد اشرف سیالوی لکھتے ہیں: "مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے "تاریخ نجد و حجاز" مولفہ "علامہ غلام رسول سعیدی" کا مطالعہ فرمائیں۔ (گلشنِ توحید و رسالت، ص:۳۹)

(۵) مقالاتِ سعیدی: اس کتاب میں آپ کے متعدّد مضامین

ہیں، یہ بھی ہندو پاک سے مسلسل شائع ہو رہی ہے۔

(۶) شرح صحیح مسلم: ۱۹۸۶ء میں آپ نے اس تصنیف کا آغاز کیا اور ۱۹۹۴ء میں اس کو مکمل کیا۔ اس کی سات ضخیم جلدیں ہیں اور مجموعی طور پر یہ کتاب آٹھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تک اس کتاب کے کثیر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں پہلی بار اس کی اشاعت کا شرف رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ/نومبر ۲۰۰۲ء میں المجمع المصباحی مبارک پور نے حاصل کیا۔ اس کے لیے ہم نے سراج الفقہا حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے ایک وقیع مقدمہ بھی لکھوایا تھا۔ حضرت مولانا شمس الہدیٰ مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ نے بھی ایک صفحہ لکھ کر دیا تھا۔ چند صفحات پر مشتمل ایک تحریر ہم نے بھی لکھی تھی۔ نیز حضرت مولانا مفتی زاہد علی سلامی استاذ و مفتی جامعہ اشرفیہ نے بھی بڑی محنت فرمائی تھی اور علما و مشائخ کے تاثرات بھی دو صفحات میں منتخب فرمائے تھے۔ ان چند صفحات میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔

سرِ دست ہم یہاں شرح مسلم شریف کی چند خصوصیات درج کرتے ہیں:

۱- تمام احادیث کا بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ۔

۲- الفاظِ احادیث پر اعراب کا التزام، قابلِ تشریح کلمات کی لغوی تحقیق و شرعی تشریح۔

۳- ہر باب کے تحت احادیث کی مختصر تشریح تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں متعلقہ باب کے بارے میں ایک اجمالی نقشہ آجائے اور موضوعِ بحث کی تعیین ہو جائے۔

۴- اصولِ حدیث کی روشنی میں احادیث پر فنی گفتگو اور نکات کی نشان دہی۔

۵- منکرینِ حدیث کے شبہات کے جوابات اور حجیتِ حدیث پر دلائل کا انبار۔

۶- فقہ حنفی پر احادیث سے استدلال اور اس کی ترجیح کے دلائل۔

۷- ائمہ اربعہ کے مذاہب کا بیان، پھر ہر ایک کے دلائل کا تذکرہ، ان پر نقد و نظر اور مذہب حنفی کی ترجیح اور اس کی حکمتوں کا بیان۔

۸- معاندینِ اہلِ سنت کے آرا اور خیالات کا ذکر، ان کا رد، اختلافی مسائل میں علمی اندازِ نگارش۔

۹- در جنوں جدید فقہی مسائل کی تحقیق، ان پر علمی تبصرے اور فیصلہ کن بحثیں۔

۱۰- پوری کتاب علمی اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہونے کے باوجود سلاست بیان اور ادیبانہ طرزِ تحریر سے مرصع اور انتہائی دل آویز ہے۔

(۷) تفسیر تبیان القرآن: ۱۹۹۴ء میں آپ نے اس تفسیر کو لکھنے کا آغاز کیا اور ۲۰۰۶ء میں بارہ ضخیم جلدوں میں مکمل کیا۔ یہ تفسیر بھی تقریباً ۱۲/ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تک اس کے کثیر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۸) نعمۃ الباری فی شرح صحیح البخاری: اس کی پہلی سات جلدیں "نعمۃ الباری" کے نام سے فرید بک اسٹال لاہور نے شائع کیں اور بعد کی ۹/ مجلدات ضیاء القرآن پبلی کیشن نے "نعم الباری" کے نام سے شائع کی ہیں۔ اس کی تصنیف کی ابتدا ۲۰۰۶ء میں ہوئی تھی اور اس کی تکمیل ۲۰۱۴ء میں ہوئی ہے۔

(۹) تفسیر تبیان الفرقان: تبیان القرآن کے بعد تفسیر تبیان الفرقان لکھنے کا سبب یہ ہے کہ تفسیر تبیان القرآن میں آپ نے امام رازی کی تفسیر کبیر سے استفادہ کیا اور "تبیان الفرقان" میں امام ابو منصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات اہل السنۃ اور دیگر مفسرین احناف سے استفادہ کیا ہے۔ تفسیر تبیان الفرقان میں آپ نے بعض آزاد منش لکھاریوں پر تعاقب کیا ہے، جیسے سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز، امین احسن اصلاحی، جاوید احمد غامدی، ابو الاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر محمد شکیل اوج وغیرہ۔ اور اسلام کے مسلم نظریات کے خلاف جو ان لوگوں کے افکار ہیں ان کا دلائل کے ساتھ مفصل رد کیا ہے تفسیر تبیان الفرقان میں قرآن مجید کا ترجمہ تبیان القرآن میں کیے ہوئے ترجمہ سے بہت سہل اور سلیس ہے۔ ان شاء اللہ یہ تفسیر چھ جلدوں میں مکمل ہوگی اس کی پہلی جلد اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ آپ کی شخصیت و فکر پر عالمِ اسلام میں مسلسل کام ہو رہا ہے، محترمہ شگفتہ جبیں زیر نگرانی پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس برائے ایم فل، علومِ اسلامیہ اپنا مقالہ مرتب فرما رہی ہیں، آپ کے مقالے کا عنوان ہے "نعمۃ الباری کا منہج و اسلوب-ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ، عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد پاکستان۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے آپ کی دینی و علمی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، آپ کو جنت الفردوس میں بلند ترین مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر و شکر کی توفیق سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ ☆☆☆☆

صدائے بازگشت

ماہ نامہ اشرفیہ بلند معیار کا حامل رسالہ

مکرمی!.....سلام مسنون

آج کا سلگتا ہوا موضوع ہے دہشت گردی۔ اسلام کی نسبت سے اس پر بہت کچھ کہا جارہا ہے۔ اس حوالے سے خاکسار نے ایک مضمون تیار کیا ہے، پہلے عرض کردوں کہ میں باقاعدہ اردو کا طالب علم نہیں ہوں، بس آپ لوگوں کی تحریریں پڑھ کر کچھ لکھنا آگیا ہے، آپ کے رسالے کا بلند معیار دیکھ کر ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اپنا مضمون آپ کو ارسال کروں۔ پھر سوچا کیوں نہ ایک بار بھیج کر دیکھا جائے۔ درخواست ہے کہ اگر مضمون ٹھیک لگے تو اصلاح کے بعد اشاعت فرمائیں۔ طالب دعا محمد انیس (کٹیہار)

رسالہ اشرفیہ مسلسل بلندی کی جانب رواں

مکرمی!.....سلام مسنون

جنوری ۲۰۱۶ء کا شمارہ اپنی خوش نما سج دھج کے ساتھ آنکھوں کے لیے تر و تازگی اور روحانی تسکین کا سامان لیے ہوئے نظر نواز ہوا۔ آپ کی لائق ستائش ذہانت و محنت سے بے باک رسالۂ اشرفیہ مسلسل بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔ شرکائے مجلس کی خدمتِ اقدس میں مبارک باد پیش کرتا ہوں قبول فرمائیں۔ اس لیے کہ فقہی سیمینار کے حل شدہ مسائل شرعیہ کے ذریعہ معلومات میں اضافہ ہوا۔ رسالہ ملتے ہی اسی وقت لگاتار پڑھنا شروع کیا، پڑھنے کے بعد پیاس بجھی نہیں۔ تمام علماے دین کے مقالے پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ مت پوچھیے، بس دل چاہتا ہے کہ ان اہل سنت کے عظیم المرتبت علما و پاک طینت مشایخ کے قدموں میں پڑا رہوں اور کیا لکھوں۔ دیوانہ ہوں بزرگوں کا۔ فقط۔ شیدائے عزیزیت۔

رئیس احمد عزیزی، ہبلی کرناٹک

علماے کرام گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مسائل حل فرماتے ہیں

مکرمی مدیر اعلیٰ!.....السلام علیکم

ابھی چند روز ہوئے اشرفیہ کا فقہی سیمینار نمبر موصول ہوا۔ واقعی آپ نے بحث کے لیے بڑے اہم اور نادر مسائل کا انتخاب کیا ہے اور الحمدللہ ہمارے علماے کرام بھی اتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مسائل کو حل فرماتے ہیں کہ دل خوش ہوجاتا ہے۔ رہا اختلاف کا باقی رہ جانا تو یہ تو ہمارے ائمۂ مجتہدین کی سنت ہے۔ ماشاء اللہ بڑی عالمانہ بحثیں ہوئی ہیں۔ جب تک ملت میں ایسے علماے کرام ہیں جماعت گمراہی سے بچی رہے گی۔ انشاء اللہ۔ سبھی مفتیانِ کرام کو مبارک باد دیتا ہوں اور ممنون ہوں۔ رسالہ بھیجنے کے لیے آپ کی نوازش کوئی بات نہیں، مگر شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔، شکریہ صد شکریہ۔

رسالہ پڑھتے میں خیال آگیا کہ حضرت حافظ ملت کا عرس قریب آگیا ہے، اس بارے میں پانچ عدد رباعیات ارسال خدمت ہیں۔ سادہ ڈاک کا تو یہاں چلن رہا نہیں، رجسٹرڈ کرا کر ہی بھیجوں گا۔ اگر شرفِ اشاعت سے سرفراز فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ ۱۸/۱۹/ دن سے سخت بیمار ہوں۔ دو دن سے طبیعت سنبھلی ہے، گذشتہ رات رباعیات کہہ لیں۔ دعا میں یاد فرمائیں۔ فقط۔ والسلام۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی

دینی مدارس میں دَم توڑتا تحقیقی ذوق

مکرمی.....سلام مسنون

اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ دینی مدارس نے دینی علوم کے فروغ اور معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر دور میں انتہائی محنت اور جستجو کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دینی مدارس کی سچی لگن کو دیکھتے ہوئے معاشرے نے بھی ان پر اعتماد کیا ہے اور آج وطن عزیز میں دینی مدارس اور طلبہ کی تعداد اس حد تک بڑھ رہی ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم مقدار میں اضافے کے ساتھ معیار میں کمی کا مسئلہ دینی مدارس کو بھی درپیش ہے اور رفتہ رفتہ مدارس میں ماضی کا تحقیقی و علمی مزاج دم توڑ رہا ہے۔

ماضی میں دینی مدارس تحقیقی مراکز ہوا کرتے تھے اور ان سے متعلق علما نے مختلف موضوعات پر ہزاروں گراں قدر اور نایاب تحقیقی کتب تصنیف کی ہیں، اس دور میں بھی بہت سے کتب لکھی جارہی ہیں، لیکن ان کا علمی و تحقیقی معیار اس پائے کا نہیں جو ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے موجودہ دور میں ان اداروں میں تحقیق کے سوتے خشک پڑتے جارہے ہیں۔ بہت سے مدارس میں درسی تعلیم کے بعد تحقیق اور تصنیف کے شعبے گزشتہ چند برسوں میں کثرت سے قائم ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی سے اسلامی تحقیقات کی اہمیت کا احساس بڑھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی شعبے سے تحقیق کے وہ مقاصد اب تک کما

حقہ پورے نہیں ہوسکے، جس کی آج قوم وملت کو اشد ضرورت ہے۔ اکثر دینی مدارس میں تحقیق و تصنیف برائے نام اور صرف نصابی سرگرمیاں حاوی ہیں۔ نتیجے میں مدارس سے غالب تعداد میں مدرسین اور مقررین یا پھر درسی کتب کے شارحین پیدا ہورہے ہیں۔ دینی مدارس کے فضلاکی اکثریت میں آٹھ دس سال تعلیم کا محور سمجھے جانے والے علوم پر دسترس حاصل کرلینے والوں کی تعداد انتہائی کم ہے اور افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد تو عربی زبان کی نصابی یا غیر نصابی کتابوں کی صحیح عبارت خوانی سے ہی قاصر ہوتی ہے۔ طلبہ کا سب سے بڑا اور اہم کام علمی تحقیقی و تصنیفی کام ہے۔ یہ کام طلبہ انفرادی طور پر اپنے شوق سے انجام نہیں دے سکتے، اس کے لیے مدارس کی سطح پر مطالعہ اور تحقیق کے لیے طلبہ کی مکمل رہنمائی اور موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق طلبہ میں علم وتحقیق کا صحیح شعور بیدار کرنے کے لیے منصوبہ بند اقدامات کی ضرورت ہے، اس کے بغیر انفرادی طور پر طلبہ کے مطالعہ وتحقیق سے وہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، جس کی ضرورت ہے۔

دینی مدارس میں فضیلت کے بعد جو "تخصص" کروائے جاتے ہیں، یہ عصری جامعات میں مختلف موضوعات میں کی جانے والی پی ایچ ڈی کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ ان تخصصات کو سائنسی اصولوں میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ عصری جامعات کی پی ایچ ڈی میں تحقیق کے جو جدید اصول اور مناہج تحقیق اپنائے جاتے ہیں، ان کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دینی مدارس کا نظام و نصاب اور مدارس میں عصری تعلیم کی ضرورت و اہمیت اگرچہ الگ موضوعات ہیں، لیکن سیرت النبی، تاریخ اسلام، اسلام کا معاشی نظام، جدید سیاسی نظریات کے تقابل کے ساتھ اسلام کا سیاسی نظام، جدید معاشرتی افکار کے ہمراہ اسلام کا معاشرتی نظام اور اس کے ساتھ استشراق، الحاد، مسلم ممالک پر مغرب کی فکری یلغار، اسلامی ممالک اور عالم اسلام کے مسائل اور جغرافیہ کو تفصیلی طور پر مدارس میں زیر بحث لانا بھی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسے کی سند فراغت دراصل علوم دینیہ کے کمرے میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ گویا ایک فارغ التحصیل آٹھ دس سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس قابل ہوگیا ہے کہ اپنے طور پر بنیادی مآخذ کا مطالعہ کرکے علم وتحقیق کے سمندر سے لعل وگہر نکال سکتا ہے۔ تاہم تحقیق اور تصنیف کے لیے جس تجسس اور تخلیقی فکر کی ضرورت ہے، وہ صرف مدارس میں رائج نصاب سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے غیر نصابی کتب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے، لیکن افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مدارس کے طلبہ میں مطالعہ کا ذوق ناپید ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے طلبہ جدید سہولتوں کی رو میں بہ گئے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے فوائد اپنی جگہ، لیکن اس نے طلبہ کی علمی سوچ و استعداد کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ اب طلبہ کی اکثریت فارغ وقت تو فضولیات میں گزارتی ہی ہے، اپنی تعلیم کا بھی بہت سارا وقت موبائل، فیس بک اور دیگر ذرائع کی نذر کردیتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب بیشتر طلبہ میں نہ تو نصابی کتابوں کے مطالعے کا ذوق رہا اور نہ ہی غیر نصابی کتابوں سے کوئی سروکار ہے۔ ماضی میں طلبہ جب مدارس سے فراغت حاصل کرتے تو نصابی کتابوں کے ساتھ سیکڑوں مفید غیر نصابی کتب کا مطالعہ بھی کرچکے ہوتے تھے۔ اب غیر نصابی کتب کا مطالعہ صرف مناظرے کے انداز میں لکھی گئی کتب کا مطالعے تک محدود ہوگیا ہے۔

دینی مدارس کو موجودہ طریق سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علمائے کرام کی متفقہ کمیٹی تشکیل دے کر اس کے تحت روز پیش آنے والے نت نئے عصری وجدید مسائل پر تحقیق کا مضبوط نظام ترتیب دینے کی بھی ضرورت ہے۔ بسا اوقات بہت سے دینی مسائل میں مختلف مدارس کے مختلف فتاویٰ جات اور مختلف موقف سامنے آتے ہیں، بلکہ بعض مدارس میں تو ایک ہی مدرسے کے مختلف علمائے کرام کے مختلف موقف ہوتے ہیں اور بہت دفعہ کسی ایک رائے پر بہت شدت سے اصرار کیا جاتا ہے اور معاصر آرا کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ ان حالات میں ایک عام آدمی ایک ہی دینی مسئلے میں متعدّد آرا کو دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دینی مسائل میں دلائل کی بنیاد پر اختلاف کا ہونا فطری امر ہے اور تمام مسائل میں مکمل اتفاق رائے کسی بھی شعبے میں نہیں ہوتا مگر عملی زندگی سے متعلق فروعی نوعیت کے مسائل میں زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے کے لیے مشترکہ ادارہ ہونا چاہیے۔ معاشرے میں اپنے بلند مقام اور بھاری ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے دینی مدارس کو غور و خوض کے بعد اس قسم کے مزید اقدامات کرنا ہوں گے، تاکہ عوام کو شرعی و دینی مسائل میں اطمینان حاصل ہوسکے۔ فقط۔ عابد محمود عزام، کراچی

دینی مدارس میں دَم توڑتا تحقیقی ذوق

مکرمی.....سلام مسنون

فل، ہاف، بالغ، نابالغ وغیرہ کا موضوع آج کل کئی معاملات میں زیر بحث ہیں، کہیں ہاف تو کہیں فل، پچھلے دنوں کی ہی بات ہے کہ ریلوے نے پانچ سال سے ۱۲/ سال کی عمر تک کے مسافروں کو کنفرم ٹکٹ لینے کی صورت میں پورا کرایہ ادا کرنے کا حکم جاری کیا، اور ویٹنگ

کی صورت میں ہاف کا جو کرایہ ہے وہی ادا کرنا ہے، جب کہ ہوائی جہاز اور الگ الگ کمپنیوں کے ہوائی جہاز کا نظام اور قانون مختلف ہوتے ہیں، عدالتی زبان میں بالغ اور نابالغ کی اصطلاحات طے شدہ ہیں، ایسے میں اگر کچھ شہری ان مصطلحات سے کہیں استفادہ کرتے ہیں تو کہیں بڑی تکلیفوں میں پھنس جاتے ہیں، ہوائی سفر میں ریلوے کے مناسبت زیادہ رقم دینے پڑتی ہے اور بنا ریزرویشن کی مناسبت میں کنفرم سیٹ کے لیے زیادہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے،

حال ہی میں نربھیا معاملے میں ایک نابالغ مجرم کو عدالت نے یہ کہتے ہوئے چھوڑنے کے خلاف عرضی کو خارج کر دیا ہے کہ ہمیں اسے رکھنے کا کوئی قانون نہیں ہے، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زنا جیسے خبیث جرم کا مرتکب کے معاملے میں بھی یہی چیز مانع ہے ،تقریباً گناہ ایک ، گناہ کرنے کی صلاحیت ایک، وجہ ایک، عمل ایک، جگہ ایک، صرف عمر کی حد بندی اور اصطلاحی حدوں کا تعین ہونے کی وجہ سے کوئی بچ جاتا ہے اور کوئی برسوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، میں ہر ذی شعور، غیور اہل علم و دانش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب کوئی بالغ ہی نہیں ہے تو کیا وہ بالغ کا کام کر سکتا ہے، اگر نہیں کر سکتا ہے تو پھر انسان اور انسانیت پر یہ دھبے کیوں لگ رہے ہیں، اس لیے بالغ اور نابالغ کی اصطلاحات میں مستعمل ہونے والی عمر کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے، جب تک بالغ اور نابالغ کی عمر پر مکالمہ اور مباحثہ نہیں کئے جائیں گے تب تک یہ تفریقِ سزا و جزا ختم نہیں ہوگی۔ آج بارہ سال کے بچے وہ گل کھلاتے ہیں کہ بڑے بڑے شرما جاتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں۔ نربھیا کا مجرم اگر چھوٹ جاتا ہے تو اس طرح کی حرکتیں کرنے والے دوسرے نابالغوں کے دلوں کا ڈر ختم ہو جائے گا اور اس طرح کے مذموم واقعات کم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہونے کا خدشہ رہے گا۔ خدا خیر فرمائے۔ فقط

مولانا محمد اختر علی واجد القادری، جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ، روڈ ممبئی

فیس بک سے متعلق چند تلخ تجربات

مکرمی.......................سلام مسنون

جدید عہد کے مواصلاتی ذرائع میں فیس بک کا کردار بے حد اہم ہے ، اس کے صارفین میں مختلف شعبہ ہائے حیات کی نمایاں ترین شخصیات سے لے کر متوسط اور معمولی درجہ کے لوگ بھی شامل ہیں۔ اربابِ تجارت اپنے بزنس کے فروغ کے لیے ، اہلِ علم اپنے علم سے افادے کی راہ ہموار کرنے کے لیے اور اصحابِ فکر اپنے افکار و نظریات کی ترسیل کے لیے اس سوشل سائٹ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

فیس بک کے استعمال کے دوران میرا سابقہ مختلف مزاج کے لوگوں سے ہوا، ان میں سے چند درج ذیل ہیں، خیال رہے کہ یہاں ہماری گفتگو صرف مذہبی طبقے کے حوالے سے ہے، دیگر لوگ اس سے خارج ہیں۔

☆یہاں پر بڑی تعداد اصحاب علم و فن کی ہے جنھوں نے فیس بک کو دعوت کے بہترین میدان کے طور پر استعمال کیا ہے، چناں چہ انتہائی اخلاص کے ساتھ وہ اس کا استعمال کر رہے ہیں اور مجھ جیسے بے شمار لوگ ان کے علمی فیضان سے سیراب ہو رہے ہیں۔

☆فیس بک پر ایک گروپ ایسا بھی ہے جو دشنام طرازی، بہتان طرازی اور بد تہذیبی کے ذریعہ خدمتِ دین پر یقین کرتا ہے، وہ دلائل سے زیادہ اپنے لہجے کو بلند کرتا ہے ، چند فروعی مسائل میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ وہ اتنا خطرناک لہجہ اپناتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

☆بعض لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات پیوست ہے کہ حق وہی ہے جسے ہم یا ہمارے فلاں حضرت نے مان لیا اور اس کے سوا سب فضول ہے۔

☆خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو آپ کی فکر سے متفق ہوتے ہیں، اس کے باوجود آپ سے صرف اس لیے برہم رہتے ہیں کہ آپ ان کے پیر صاحب سے بیعت کیوں نہیں ہوئے، یہی مقام ہے جہاں آپ کی ہر خوبی ان کی نگاہ میں بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے، ہمیں ایسے لوگوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔

☆بعض لوگ ایسے کمنٹ پاس کرتے ہیں جن سے آپ مشتعل ہو جائیں اور پھر وہ اپنی پلاننگ کے مطابق "تم تیر آزماؤ ہم جگر آزمائیں" کا معرکہ گرم کریں۔ شب وستم کا یہ معرکہ تب تک گرم رہتا ہے جب تک اس کے بطن سے ایک نئے "صلح کلی" کا جنم نہ ہو جائے۔

☆فیس بک پر بڑی تعداد پیرزادگان و صاحب زادگان کی بھی ہے جو وقتاً فوقتاً اپنی دیدہ زیب تصاویر کی اشاعت کر کے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی فکر قیمتی لباسوں، عالی شان محلات، نرم چھڑیوں کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے۔ سجنے سنورنے اور حسن و نزاکت میں ان کے سامنے فلمی سورما بھی پھیکے پڑ جاتے ہیں، تصوف طریقت اور ارادت و محبت کے نام پر ان کی جھولی میں یہی سب کچھ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ فقط۔

از: ابو حسام سید قمر الاسلام، فتح پور (یوپی)

خیر و خبر

دار العلوم سلطان الہند راجستھان میں عرس پاسبان ملت

۱۹؍ جنوری صبح ۱۰؍ بجے مقام علاقہ شیخاوٹی راجستھان کی درس گاہ دار العلوم سلطان الہند میں حسب روایت عرس خطیبِ مشرق حضرت علامہ مولانا مشتاق احمد نظامی الہ آبادی کا انعقاد کیا گیا جس میں جمیع اساتذہ و راکین و طلبہ و دیگر مقامی علما حضرات نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز قاری محمد ایوب کی تلاوت سے ہوا۔ نظامت کے فرائض مولانا ریحاب احمد صدیقی صدر المدرسین دار العلوم سلطان الہند نے انجام دیے۔ مفتی شفیق احمد غوری، مولانا نظر الحق نوری، مولانا نوشاد سلطانی، مولوی عمران رام پوری، قاری محمد رفیق بھائی، حافظ خورشید عالم نے اپنے اپنے انداز میں علامہ نظامی علیہ الرحمہ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔

آخر میں بانی ادارہ و تلمیذ و خلیفہ حضور پاسبانِ ملت حضرت مولانا امتیاز احمد صدیقی نے علامہ نظامی علیہ الرحمہ کی دینی و ملی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میں نے آپ کی حیاتِ مبارکہ کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا کہ آپ جس جس شخص کے بارے میں جو فرمادیتے تھے، وہ بات اس کی زندگی میں رونما ہو ہی جاتی تھی ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جو آپ کو نذر و تحائف ملتے وہ بھی آپ دار العلوم غریب نواز کی نذر کر دیا کرتے تھے، پوری زندگی بے لوث دین کی خدمت کرتے رہے اور اپنے علم و عمل اور زبان و قلم سے ہر محاذ پر قوم و ملت کی رہ نمائی کرتے ہوئے نظر آئے، ۔ ردِ وہابیت و نجدیت میں آپ کی تصانیف دیوبندیت کے منہ پر ایسی کاری ضرب ہیں کہ جن کا ازالہ آج تک ممکن نہ ہوسکا۔

یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ پاسبانِ ملت علیہ الرحمہ کی ذات میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ کی ہر ہر سانس عشقِ رسالت سے لبریز تھی، یہی وجہ تھی کہ نصف صدی تک آپ سنی جلسوں کے افق پر چھائے رہے۔ ادارہ دار العلوم سلطان الہند بھی آپ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ آخر میں صلاۃ و سلام کے ساتھ علامہ نظامی و حضور مجاہد ملت علیہما الرحمہ کی بارگاہ میں ایصالِ ثواب کیا گیا۔ از: فیضان احمد صدیقی۔

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال متعصب عالمی میڈیا کی منصوبہ بند سازش ہے (مولانا مقبول احمد سالک مصباحی)

آج عالم اسلام ظلم و ستم، درد و کرب اور خاک و خون کے جس دریا سے گذر رہا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دو دہائی پہلے ہم صرف کشمیر اور فلسطین کے لیے رو رہے تھے آج پورا عالم عرب ہی فلسطین کا منظر پیش کر رہا ہے اکثر عرب ممالک تباہیوں اور بربادیوں کے نئے نئے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں ۔ عالم اسلام کی یہ خونچکاں اور پیچیدہ صورت حال اچانک نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کے پیچھے صہیونی طاقتوں کا سازشی دماغ اور عالمی میڈیا کی منصوبہ بند ریشہ دوانیاں کام کر رہی ہیں ، کیونکہ عالمی طاقتوں کو یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اگر اسی تیزی سے اسلام پھیلتا رہا اور مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا رہا تو دوسری تہذیبوں اور قوموں کا کیا ہوگا ؟ اس لیے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو مسائل میں الجھا کر اس کی توجہ کو تقسیم اور اس کی توانائی کو ضائع کر دیا جائے ۔ لیکن اسلام کی اصل اور حقیقی روحانی پرکشش تعلیمات کی سچائی اور تاثیر نے ان کی تمام تدبیروں کو ناکام بنا دیا ہے ۔ الحمد للہ ! تمام تر مشکلات و مسائل کے باوجود اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن کر ابھر رہا ہے ۔ ان خیالات کا اظہار حضرت مولانا مقبول احمد سالک مصباحی بانی و مہتمم جامعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نئی دہلی نے پیغام امن و دعوت فکر کانفرنس میں کیا۔ جس کا انعقاد نوجوانان اہل سنت کوسہ ممبر ضلع تھانے کے بینر تلے عمل میں آیا ۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ مسلم طبقات سے اپیل کیا کہ وہ اسلام کے متعلق پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے اپنا رول ادا کریں خاص کر نوجوانوں کا وہ ذہین اور باصلاحیت طبقہ جو میڈیا ٹیکنالوجی سے جڑا ہوا ہے، وہ خلوص اور لگن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا استعمال اصل اسلامی نقطہ نظر کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کرے ۔ اس سلسلے میں انہیں معذرت خواہانہ یا مدافعانہ طریقہ کار اپنانے کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ پیش قدمی کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلیں اور عصری دانشگاہوں سے لے کر سرکاری و نیم سرکاری اداروں تک پہنچائیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

پروگرام کی صدارت مولانا محفوظ الرحمن علیمی نے فرمائی جب کہ نظامت قاری دلشاد احمد فاروقی سدھارتھ نگری نے فرمائی۔ اجلاس کی سرپرستی پیر طریقت مولانا سید عبدالرب عرف چاند بابو زیب سجادہ آستانہ عالیہ مخدومیہ سبحانیہ بلہری شریف فیض آباد یوپی نے فرمائی۔

از: محمد صادق علی استاذ مدرسہ اشرفیہ کوسہ ممبرا

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پر سیمینار کا انعقاد

لکشمی پور (مہراج گنج) خانقاہ ایوبیہ پیپرا کنک ضلع کشی نگر کے زیرِ اہتمام عرس علامہ محمد ایوب شریف القادری کے موقع پر برصغیر ہندو پاک کی مرکزی شخصیت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی حیات و خدمات کے موضوع پر ایک سیمینار علامہ یٰسین اختر مصباحی دار القلم دہلی کی صدارت، علامہ محمد احمد مصباحی ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی قیادت، علامہ فروغ احمد اعظمی پرنسپل دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کی اور صاحبِ سجادہ مولانا قاری محمد سبطین رضا قادری ایوبی کی نگرانی میں ہوا۔ علما نے کہا کہ غیر منقسم ہندوستان کے علما و مشائخ کا سلسلہ تلمذ تین چار واسطوں سے علامہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے جا ملتا ہے۔ حدیث کی نشر و اشاعت میں آپ کا اور آپ کے خاندان کے دیگر احباب کا اہم رول رہا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مقالہ پیش کرنے والوں میں مولانا نفیس احمد مصباحی جامعہ اشرفیہ، مولانا اختر حسین فیضی مصباحی جامعہ اشرفیہ، مولانا محمد نظام الدین مصباحی دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، مولانا رضاء المصطفیٰ برکاتی، مفتی محمد صادق مصباحی سعید العلوم لکشمی پور، مولانا شمس الدین مصباحی، مولانا کمال احمد علیمی ساحل مصباحی، مولانا فیض الرحمٰن ایوبی کے نام شامل ہیں۔ واضح ہو کہ گذشتہ دن مزار شریف پر چادر پوشی کی گئی اور جلوسِ قادری ایوبی نکالا گیا۔ اس موقع پر مولانا امید علی صدیقی مصباحی، قاری محمد علاء الدین برکاتی، قاری محمد ہاشم رضا، مولانا محمد کونین رضا قادری ایوبی، مولانا حسنین رضا قادری، محمد ثقلین رضا قادری، مولانا سلیمان کوثر مصباحی، محمد امجد قادری ایوبی سمیت کثیر تعداد میں عقیدت مند موجود تھے۔

اخیر میں علامہ یٰسین اختر مصباحی قاری محمد سبطین رضا قادری ایوبی و دیگر ذمہ داران نے یہ فیصلہ کیا کہ آنے والے سال جو عرس ہوگا اس موقع پر علامہ عبد العلی فرنگی محلی کی شخصیت پر سیمینار ہوگا۔ علامہ مصباحی نے کہا کہ علامہ عبد العلی فرنگی محلی کی شخصیت کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ آنے والے سال منعقدہ سیمینار علامہ عبد العلی فرنگی محلی لکھنؤ کی حیات و خدمات پر ہوگا۔

مذکورہ سیمینار میں مجلہ "یادگارِ ایوبی" کا رسمِ اجرا علما و مشائخ کے ہاتھوں کیا گیا۔ سیمینار میں موجود شرکا نے شاہ سبطین رضا قادری ایوبی اور ان کے رفقا کے کارناموں کو خوب سراہا اور کہا کہ اللہ انھیں نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

دوپہر ساڑھے بارہ بجے قل شریف کا پروگرام ہوا۔ صدر العلما علامہ محمد احمد مصباحی کی دعا پر سیمینار کا اختتام ہوا۔ عرس میں دہلی، ممبئی، ایم پی، راجستھان، کلکتہ سمیت دیگر ریاستوں سے زائرین کثیر تعداد میں آئے ہوئے تھے۔

واضح ہو کہ گذشتہ شب مذکورہ خانقاہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے نسواں ادارہ کی جانب سے خواتینِ اسلام کا ایک اہم دینی جلسہ ہوا، جس میں ادارہ کی طالبات نے نعت و منقبت، حمد وغیرہ کے اشعار اچھے انداز سے پڑھیں اور مختلف عناوین پر تقاریر کیں۔

از: خانقاہ ایوبیہ قادریہ پیپرا کنک، کشی نگر

ماہ نامہ اشرفیہ حاصل کریں

کولکاتا میں

حافظ محمد عارف صاحب

مومن پور روڈ 35/H/12، خضر پور، کولکاتا 23

بھیونڈی میں

محمد عارف دانش رضوی صاحب

متصل ڈاکٹر پرویز انصاری، اللہ والی مسجد کے پیچھے

زیتون پورہ، بھیونڈے، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

نوٹ:

اہلِ قلم حضرات سے گذارش ہے کہ ماہ نامہ اشرفیہ کے لیے مضامین، مراسلات یا خبریں اگر جے پی جی فارمیٹ یا بٹ میپ میں ای میل نہ کیا کریں بلکہ ڈائریکٹ اوپن ہونے والی فائلوں میں ہی بھیجیں۔ فائل اگر کمپوز کی ہوئی ہے تو اس کی پی ڈی ایف فائل نہ بھیجیں بلکہ ان پیج یا ایم ایس ورڈ کی فائل ہی ای میل کریں۔ (ادارہ)